

سلام گوئی کا فن اور اس کی روایت

تلخیص

مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی (اردو)

نگراں
ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی

مقالہ نگار
تمکین حسین

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یو۔ پی) انڈیا

۲۰۱۰ء

تلخیص

اردو شاعری میں سلام گوئی کی ابتدا مرثیہ گوئی کی ابتدا کے ساتھ ہوئی۔ جس کا مقصد حصول ثواب اور کربلا کے شہیدوں کی تعریف وتوصیف اوران کے غم کی یاد کو تازہ کر کے سوگواری کی فضا قائم کرنا ہوتا تھا۔

رثائی شاعری کا جز ہونے کے سبب سلام کا عمومی مزاج اگر چہ حزنیہ ہوتا ہے۔ لیکن دیگر رثائی اصناف کے مقابلہ اس میں ایک طرفگی یہ ہوتی ہے کہ سلام کبھی کبھی حزن سے ہٹ کر طرب کی طرف بھی آجاتا ہے۔ لیکن اس کا طربیہ انداز سلام کے موضوعات، ہیئت اور بیانات سے یکسر منحرف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں صرف اتنا فرق واقع ہوتا ہے کہ اس کے بیانات کی فضا سوز ورثا کے عناصر سے ایک حد تک خالی ہو جاتی ہے۔ کچھ سلاموں میں ہیرو کی شجاعت، اس کے مردانہ اوصاف، مدمقابل پر فتح اور نیک کرداروں کے اخلاق کی بلندیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے سلام عام طور پر منقبتی سلاموں کے زمرے میں آتے ہیں۔

بنیادی طور پر سلام کے موضوعات کا تعلق مذہب اور عقیدے سے ہوتا ہے۔ لیکن ترقی یافتہ دور کے سلاموں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن کا براہ راست تعلق نہ مذہب سے ہے نہ جذبہ عقیدت سے اور نہ مدح اہلبیتؑ سے۔

سلام کی جتنی تعریفیں اب تک نظر سے گذریں ان میں سے کوئی بھی تعریف سلام گوئی کے تمام ادوار کا احاطہ نہیں کرتی۔ ابتدائی دور میں سلام کی ہیئت کا انتخاب شاعر کی صوابدید پر منحصر ہوتا تھا اور کئی ہیئتوں میں سلام کہے جاتے تھے۔ لیکن ترقی یافتہ دور میں غزل کی ہیئت سلاموں کے لئے

مخصوص تصور کی جانے لگی۔

ترقی یافتہ دور سے پہلے منفردہ یعنی غزل کی ہیئت میں ایک مکمل سلام دکنی شاعر درگاہ قلی خاں درگاہ کا ملتا ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں بھی کئی ہیئتوں میں سلام کہے جانے کی مثالیں ملتی ہیں۔

شمالی ہندوستان میں سلاموں کے ابتدائی نقوش محمد شاہ رنگیلے کے عہد سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلام گوئی کے لئے بطور صنف کے یہی زمانہ با قاعدہ تشکیل اور تعین کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر چہ جنوبی ہندوستان کو اس صنف کی غیر شعوری نشو ونما میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن با قاعدہ تشکیل، ارتقا اور ہیئت و موضوعات کے تعین کا اعزاز شمالی ہندوستان کو ہی حاصل ہے۔

شمالی ہندوستان میں دلی کے بعد اودھ کا علاقہ اس صنف کی ترقی اور عروج کا مرکز قرار پایا۔ سلام کی صنف کی شہرت اور ایک وسیع حلقہ میں اس کی شناخت اور مقبولیت کو عام کرنے کا شرف بھی اسی خطہ کو حاصل ہے۔ صنف سلام کی تعریف بھی عموماً اسی دور کے سلاموں کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے۔ اگر چہ منقبتی سلاموں کی تعداد بھی کافی۔ لیکن زیادہ شہرت اور اہمیت رثائی سلاموں کو ہی حاصل ہے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں اور نعت نویسوں نے معمولی ردو بدل کے ساتھ سلام گوئی کو رثائی ادب کا ایک جز قرار دیتے ہوئے تقریباً ایک جیسی تعریفیں کی ہیں۔

سلام گوئی کے ابتدائی دور میں سلام، سلامی، مجرا اور مجرائی جیسے اصطلاحی اور علامتی الفاظ کا استعمال پابندی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ یہ الفاظ سلام گوئی کے طرز خاص کا جز سمجھے جاتے تھے اور ان کی موجودگی کسی نظم کے سلام ہونے کی دلیل تصور کی جاتی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ انیسؔ و دبیرؔ تک ہی قائم رہا۔ ان دونوں شعرا کے زمانے سے اس طرز میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ مضامین میں جدت کے ساتھ سلاموں میں غیر رثائی موضوعات کی شمولیت بھی اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی۔

سلام جیسے جیسے فطری تقاضوں کے قریب آتا گیا، اس کی مقبولیت اور پذیرائی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مرثیہ گویوں اور مرثیہ خوانوں کی ضرورت بن گیا۔ اس بات کا ذکر

کئی محققین نے کیا ہے کہ مرثیہ خوانی سے پہلے مجلس عزا کی فضا بنانے اور سامعین کو مرثیہ سننے کے لئے پوری طرح آمادہ اور تیار کرنے کی خاطر مرثیہ سے پہلے سلام پڑھے جانے کا رواج عام ہوگیا۔

بعض محققین نے سلام کو غزل کا قائم مقام قرار دیا ہے۔ لیکن سلام گوئی کے ابتدائی دور پر یہ تعریف منطبق نہیں ہوتی۔ مرثیہ کے لئے مسدس کی ہیئت طے پا جانے کے فوراً بعد کے سلاموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرانہ فن کاری کے مظاہرے اور شعری وسائل کے استعمال کے باوجود سلام میں رثائیت کو اولیت کا درجہ ہمیشہ حاصل رہا۔ انیسؔ کے عہد سے سلاموں میں شاعرانہ حسن اور فنکاری کے مظاہرے کے ساتھ سلاموں کے مضامین میں بھی خاصی جدت اور رنگینی پیدا ہوگئی۔ اس دور کے سلاموں کو (چند مستثنیات کے علاوہ) سامنے رکھ کر سلام کی تعریف متعین کی جائے تو سلام صحیح معنوں میں غزل کا بدلا ہوا روپ اور اس کا قائم مقام نظر آئے گا۔

موجودہ دور میں ہیئت اور مضامین کے اعتبار سے سلام اور غزل دونوں میں بہت حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں اصناف میں وزن اور قافیے کی مشترک ترکیب استعمال ہوتی ہے اور دونوں ہی اصناف کے اشعار میں تسلسل کا پایا جانا ضروری نہیں۔

غزل میں خارجی اور داخلی دونوں ساختوں میں یکسانیت ہوتی ہے اور خارجی نکتہ نظر سے ہی داخلی معنی کی مراد و منشا کا تعین ہوتا ہے۔ لیکن سلام کی صرف خارجی ساخت غزل سے مطابقت رکھتی ہے۔ سلام کی داخلی ساخت کے مطالبات غزل کی داخلی ساخت کے مطالبات سے مختلف ہوتے ہیں اور کبھی کبھی دونوں میں اتنا تفاوت ہوتا ہے کہ دونوں اصناف میں استعمال ہونے والے ایک ہی لفظ کے منشا میں بعد المشرقین جیسا فاصلہ ہوتا ہے۔

سلام کا مرکزی موضوع اگر چہ رثائی ہوتا ہے۔ لیکن سلام میں اپنے ذاتی تجربات و احساسات اور قلبی واردات کے اظہار کی آزادی مرثیہ کے مقابلے میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سلام کا دامن مرثیہ کے مقابلے میں غزل کی جیسی وسعت اور کشادگی سے آراستہ ہوتا ہے۔ لیکن جو الفاظ اور استعارے غزل میں کسی اور معنی اور مفہوم کی ادائیگی کرتے ہیں، سلاموں میں آنے کے بعد اپنے معنی اور مفہوم کے ارادے اور منشا کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ کیونکہ

سلام گوئی کا محرک محبوبانِ الٰہی سے عقیدت اور محبت کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے، جسے غزلیہ شاعری میں بیان کیے جانے والے عشق کی عمومی تعریف سے ارفع و اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ اس وصف کے باوجود کہ غزل کی مخصوص لفظیات، تراکیب، استعارے اور تمام ترفنی کمالات کی موجودگی سلاموں میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

مرثیہ گوئی کے فن میں شاعر کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جن آداب و احتیاط کو ملحوظ رکھنا مرثیہ گوئی کے لئے لازم تصور کیا جاتا ہے۔ انھیں بجالانا ہر شاعر کے لئے ممکن نہیں۔ اس وجہ سے رثائی شاعری سے دلچسپی، مناسبت اور لگاؤ رکھنے والے بیشتر شعرا نے اپنے رثائی جذبات کے اظہار کے لئے مرثیہ گوئی کے بجائے سلام گوئی کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ اس صنف کے لئے غزل کی ہیئت اور لفظیات میں رثائی مضامین کا بیان ان کے لئے زیادہ آسان تھا۔

اگرچہ مسدس کی ہیئت مرثیہ گوئی کی لازمی شرطوں میں شامل نہیں۔ ابتدا میں مرثیے مختلف ہیئتوں میں کہے جاتے تھے۔ لیکن مرثیہ کا عنوان اس کے مطالبات اور مشکلات کو کچھ اس طرح بڑھا دیتا ہے کہ سوداؔ جیسے مشکل پسند ماہرِ فن کو بھی یہ صنف ''دقیق ترین'' اور ''مشکل ترین'' نظر آئی۔ غالباً اسی لئے شعرا نے مرثیہ گوئی کے فن کی مشکلات اور تقاضوں سے اپنا دامن بچا کر اس کے استعاروں کے وسیلے سے اپنے جذبات کو غزل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

غزل کی شاعری میں اگرچہ احساسات کے اظہار کی آزادی زیادہ حاصل ہے۔ لیکن وہ مضامین اور قلبی واردات جن کے اظہار کی گنجائش غزلوں میں براہِ راست ممکن نہیں، مرثیہ گو شعرا نے انھیں، تلمیحات استعاروں اور دیگر تراکیب کے وسیلے سے مہذب پیرائے میں بیان کرنے کی راہ سلاموں میں نکال لی۔

جو الفاظ اور استعارے غزلوں میں کسی اور مفہوم کی ادائیگی کرتے ہیں، وہی سلاموں میں آنے کے بعد اپنے پس منظر، پیش منظر اور اقتضائے حال کے مطابق اپنے معنی اور مفہوم کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ یہی تبدیلی سلاموں کی شعریات کی تخلیق کرتی ہے۔

غزلوں میں معشوق، محبوب، کافر، ظالم اور ستم گار کا استعارہ جو مفہوم ادا کرتا ہے، مذہبی

اور اعتقادی شاعری میں اسی لفظ محبوب اور معشوق سے مراد کبھی اللہ کے رسول ﷺ ہوتے ہیں، کبھی امام حسینؑ اور کبھی دیگر اولیائے خدا۔ اسی طرح کافر اور ظالم وستم گار کا لفظ جب غزلوں میں آتا ہے تو وہ دنیاوی اور مجازی معشوق کی بے وفائیوں اور کج ادائیوں کا استعارہ ہوتا ہے۔ لیکن مذہبی اور اعتقادی اصطلاحات ان الفاظ کے معنی کو یکسر تبدیل کر کے ان کے لغوی اور شرعی معنی اور اصطلاحات پیش کرتی ہیں۔ غزل کی شاعری میں کافر، ظالم، ستم گار اور اسی قبیل کے الفاظ کے حقیقی معنی مراد نہیں لیے جاتے، جبکہ مذہبی شاعری میں خالص حقیقی معنی ہی مراد لیے جاتے ہیں۔

کس موقع پر کون سا معنی مراد لیا جائے اس کا فیصلہ شعر کے مضمون اور موضوع کی نوعیت کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی کیفیت سے ہوتا ہے۔ دونوں موقعوں پر مضمون، موضوع اور داخلی کیفیات کی تبدیلی سے الفاظ کی فطری تصویر بدل جاتی ہے۔ یہیں سے سلام کے فن میں غزل کے ساتھ ساتھ مرثیہ اور دیگر اصناف سے امتیاز کا آغاز ہوتا ہے۔

سلام کے فن کو ترقی دینے کا ایک بڑا فائدہ مرثیہ نگاروں کو یہ ہوا کہ انھیں اپنے مہذب عشقیہ جذبات کی تشفی کے لئے ایک شائستہ موضوع اور مناسب پلیٹ فارم مل گیا۔ اس طرح صنف سلام کی مسلسل ترقی نے مرثیہ گو شعرا کو غزل گوئی کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا۔

غزل گو شعرا کو سلام گوئی کے فن کی ترقی سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ مرثیہ گوئی کے فن کے دقائق اور مشکلات سے بچ گئے اور اپنے اعتقادی اور عقیدت مندی کے جذبات کو اشعار کی اسی ہیئت میں ڈھال دیا جس ہیئت اور سانچے میں ڈھالنے کے وہ ماہر اور مشاق تھے۔ غالبؔ کا سلام اس خیال کا معتبر گواہ ہے۔



SALAAM GOYEE KA FUNN AUR USS KI RIWAYAT

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

By

TAMKEEN HUSAIN

UNDER THE SUPERVISION OF

DR. MEHTAB HAIDER NAQVI

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH - 202 002 (INDIA)

2010


MAULANA AZAD LIBRARY
A.M.U.


T7612



سلام گوئی کا فن اور اس کی روایت

مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی (اردو)

نگراں
ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی

مقالہ نگار
تمکین حسین

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یو۔ پی) انڈیا

۲۰۱۰ء



Department of Urdu

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH – 202002 (INDIA)

Certificate

To Whom It May Concern

*This is to certify that the Ph.D. thesis of Mr. Tamkeen Husain entitled "**Salaam Goyee Ka Funn Aur Uss Ki Riwayat**" is an original work, and it can be submitted for the award of the Ph.D. degree.*

(Prof Mohammad Zahid)
Chairman

(Dr. Mehtab Haider Naqvi)
Supervisor

انتساب

امّاں ابّا اور بھائی بہنوں کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

صفحہ نمبر

پیش لفظ

پیش لفظ

سلام گوئی کے دوسو سے تین سو برس کے عرصہ پر مشتمل شعری سرمائے اور تخلیقات کو ادب کے اعلیٰ فنی معیار پر جانچا جائے تو اس کا بیشتر حصہ ''نارسیدہ ونا تراشیدہ'' ہونے کے سبب قابل توجہ نہیں سمجھا جائے گا۔ سلاموں کے خطیر ذخیرے میں سے چند مخصوص شعرا کا کلام ہی شمار کے قابل ہوگا اور انھیں کی بدولت سلام کی ادبی حیثیت اور قدر و قیمت طے ہوگی۔

رثائی ادب کے بعض شعرا ایسے ہیں جو ایک مخصوص رجحان اور خاص ادبی ماحول میں پیدا ہوئے اور اس ادبی رجحان کے تبدیل ہونے اور ماحول کے بدلنے کے ساتھ شاعری کے فنی اور ادبی تقاضوں کو پورا نہ کر سکے جس کے سبب انھیں خاموشی اختیار کرنی پڑی، اور جو شعرا اپنی ہی ڈگر پر چلتے رہے وہ زمانے کی ترقی کے ساتھ اپنے ذہنی ارتقا کا ثبوت نہ دینے کی وجہ سے ادبی حلقوں میں اپنا نام باقی نہ رکھ سکے۔

اس مقالہ میں ابتدا سے لے کر اب تک کی صورت حال کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور زمانہ کے ساتھ سلام کی صنف میں ہیئت اور مواد کے نقطۂ نظر سے کتنی طرح کی تبدیلیاں آئیں اور ہیئت و تکنیک کے کتنے تجربے شعوری اور غیر شعوری طور پر کیے گئے ان کا مطالعہ کر کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیر نظر مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں مقالہ کا موضوع **''سلام گوئی کا فن اور اس کی روایت''** کے سبھی ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان **''سلام کی صنف کا تعین، ہیئت، موضوعات اور فن''** ہے۔ اس باب میں سلام کی صنف کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بات کو تاریخی حقائق اور منطقی دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سلام غزل کی ہیئت اور مرثیہ کے موضوعات سے مطابقت رکھنے کے باوجود کس طرح دونوں سے ممیّز اور ممتاز ہے۔ اس باب میں ہیئت کی بحث اس نقطۂ نظر سے دل چسپ ہے کہ سلام گوئی کے فن

میں طبع آزمائی اپنی ابتدا سے اب تک کئی ہیئتوں میں کی گئی ہے۔

ترقی یافتہ زمانے سے اب تک سلام بڑی حد تک منفردہ یعنی غزل کی ہیئت تک محدود ہونے کے باوجود گوناگوں موضوعات کا احاطہ کرتا ہے، اور اس صنف میں ایسے مضامین شامل ہوتے ہیں جو کلیتاً بینیہ اور رثائی بھی نہیں ہوتے اور بین ورثا سے پوری طرح خالی بھی نہیں ہوتے۔ سلاموں میں رثائی مضامین کے ساتھ غزلیہ مضامین کا شستہ آہنگ متوازی طور پر شامل رہتا ہے، جس سے دو متضاد موضوعات کی ترکیب ایک منفرد فن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان تمام نکات پر تفصیلی گفتگو اس باب میں شامل ہے۔

دوسرے باب کا عنوان **''سلام گوئی کی روایت''** ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دونوں حصوں میں سلام گوئی کی روایت پر بحث کی گئی ہے۔ پہلے حصّے میں سلام کی صنف کے آغاز اور رثائی موضوعات سے اس کے رشتے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے حصّے میں ہیئت کے اعتبار سے سلام نگاری کے ارتقا اور موجودہ ہیئت کے تعین کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس طرح ان تمام سوالات کے تشفی بخش جواب فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس موضوع کے مطالعہ کے وقت قاری کے ذہن میں آ سکتے ہیں۔

مقالہ کا تیسرا باب **''سلام گوئی کے ابتدائی دور''** کے شعرا کے تذکرے اور ان کے نمونۂ کلام و خصوصیات کلام پر مشتمل ہے۔ اس باب میں دکن اور دلّی کے ان اوّلین شعرا کا ذکر ہے جو سلام گوئی کے بانی اور روح رواں تصور کیے جائیں گے۔ جنوبی ہندوستان میں سلام گوئی کی ابتدا اردو شاعری کی ابتدا کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس لئے جنوبی ہندوستان میں سلام گوئی کا زمانہ اس صنف کی تخلیق کا عہد طفلی قرار پائے گا۔ اس بنا پر دکن کے ابتدائی دور کے سلام ترقی یافتہ دور کے ادبی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ لیکن نقش اوّل ہونے کے سبب ان سلاموں کی حیثیت کلاسیکی باقیات کے نمونے جیسی ہے۔ اس وجہ سے اس دور کے سلام کم سے کم نقش اول ہونے کے اعتبار سے قابل ذکر اور اہمیت کے حامل ہیں۔

کلاسیکی اور ادبی مرتبے کے اعتبار سے جنوبی ہندوستان کے صرف دو شعرا قابل ذکر ہیں۔

ابو القاسم مرزاؔ سلام کی صنف کے بانی اور تقدم زمانی کے اعتبار سے اور درگاہ قلی خاں درگاہؔ ادبی مرتبے اور ترقی یافتہ آہنگ کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔ ابتدائی دور کے شمالی ہندوستان کے شعرا میں مسکینؔ، ضاحکؔ اور سوداؔ سلام کی صنف کے نقیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چوتھے باب کا عنوان **''سلام کی صنف کے عروج کا زمانہ''** ہے۔ اس باب میں سلام گوئی کے ترقی یافتہ زمانے کا ذکر ہے، جس کی باری دکن اور دلّی کے بعد آتی ہے۔ اس عہد کے بیشتر ادبی سرمائے کا تعلق اودھ کے زرخیز خطے سے ہے۔ اس دور تک آتے آتے سلام کی صنف اپنی ترقی کی بیشتر منزلیں طے کر چکی تھی۔ صرف تزئین و آرائش کے مرحلے باقی رہ گئے تھے۔ اودھ آکر صنف سلام کے وہ مراحل بھی بہ حسن وخوبی طے ہو گئے جنھوں نے اسے ایک مایہ ناز اور ممتاز فن کی حیثیت عطا کرنے کی راہ ہموار کی۔ اس عہد سے سلام گوئی ایک مکمل صنف کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جانے لگی۔

اگر چہ ترقی یافتہ دور میں دلی میں بھی سلام کہے جا رہے تھے۔ لیکن یہ سلام بیشتر ایسے شعرا سے منسوب ہیں جو خالص غزل گو تھے اور ان کے سلاموں کی ادبی حیثیت لکھنوی سلاموں کے مقابلے بہر حال کم تھی۔ دہلوی سلاموں میں بہت سے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ غالبؔ اور داغؔ کے سلام نمونہ کے طور پر اس باب میں شامل ہیں۔ لیکن اس باب میں زیادہ توجہ اودھ کے علاقہ میں تخلیق پانے والے سلاموں خدوخال کے نقوش اور باریکیوں کو واضح کرنے میں صرف کی گئی ہے، کیونکہ اس سلسلے کا بیشتر معیاری ادبی سرمایہ اسی علاقہ کے حصّے میں آیا ہے۔

مقالہ کے پانچویں باب کا عنوان **''صنف سلام کی موجودہ صورت حال۔ اہم شعرا کا جائزہ''** ہے۔ اس باب میں بیسویں صدی سے لے کر حال تک کے نمائندہ شعرا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ سلاموں کے بدلتے ہوئے موضوعات پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے مطالعے کے دوران یہ نکات بہت واضح طور پر سامنے آئیں گے کہ سلام ایک خالص مذہبی اور رثائی صنف سے آگے بڑھ کر کس طرح ایک معیاری ادبی صنف میں تبدیل ہوا اور نئے طرز و انداز کی ایک ایسی غزل معلوم ہونے لگا جس میں رثائی موضوعات، اخلاقیات اور مذہبیات کے ساتھ معاشرتی موضوعات پر تنقید کی گنجائش بھی نکل آئی۔

الحمد اللہ اب جبکہ یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا، مجھے اپنے ان محسنوں کی یاد آرہی ہے جن کے احسان اور مدد کے بغیر اس منزل تک پہنچ پانا میرے لئے قطعاً ممکن نہیں تھا۔ اماں، ابا اور بھائی بہنوں نے میری جتنی مدد اور حوصلہ افزائی کی اس کے ذکر وشکر کے لئے کوئی بھی لفظ کافی نظر نہیں آتا۔

میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی اور اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے نوازا۔ ان کی زبان دانی تحقیق کے میدان میں گہری دل چسپی، نکتہ رسی اور توجہ دہانی نے میری زبان اور تحقیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور ذہن کو روشن اور پختہ کیا۔

میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر قاضی افضال حسین، صدر شعبہ اردو پروفیسر محمدؐ زاہد اور اساتذہ کرام پروفیسر ابو الکلام قاسمی، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر عقیل احمد، پروفیسر سید محمدؐ امین، پروفیسر سید محمدؐ ہاشم، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر ظفر احمد، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر اقبال حسین صدیقی، ڈاکٹر سراج اجملی اور ڈاکٹر خالد سیف اللہ صاحبان کا بے حد شکر گذار ہوں جنھوں نے بے حد خلوص ومحبت کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی۔

اس کے علاوہ میں مولانا آزاد لائبریری کے اردو سیکشن کے باقر بھائی، محسن بھائی اور شعبۂ اردو کی سیمینار لائبریری کے سہیل بھائی کا بھی بے حد ممنون ہوں جن سے مجھے اپنے تحقیقی کاموں کے دوران کتابیں حاصل ہوئیں۔

اپنے سینیر رفقا میں ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر فتح عالم، ڈاکٹر نوید انجم، آفتاب عالم، محمد طارق، لئیق احمد، کمال اختر، مامون رشید، نہال الدین صاحبان کا بھی احسان مند ہوں جنھوں نے ہر مشکل مرحلے میں میرا بے حد خیال رکھا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں محمدؐ شارق، محمدؐ فاروق، ابوسالم، سرفراز انور، ناظر حسین، اپنے روم پارٹنر محمدؐ ندیم اور قاسم حسین کو یاد نہ رکھوں جن کے دم سے میری بزمِ حیات روشن ہے۔ میں اپنے ان تمام ساتھیوں کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

تمکین حسین

پہلا باب

سلام کی صنف کا تعین، ہیئت، موضوعات اور فن

اردو میں مرثیہ کی ابتداء کے ساتھ ہی سلام گوئی کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں سلام کسی مخصوص ہیئت کے پابند نہیں ہوتے تھے۔ مرثیوں کی طرح سلام بھی مختلف ہیئتوں میں نظم کیے جاتے تھے۔ ان کا مقصد حصول ثواب اور کربلا کے شہیدوں کی تعریف وتوصیف اور ان کے غم کو تازہ کر کے سوگواری کی فضا قائم کرنا ہوتا تھا۔ مرثیہ اور سلام کی ابتدائی ہیئتوں میں ایک ہیئت منفردہ (ا) کی تھی جو بعد میں سلام کے لئے مخصوص ہوگئی۔

سلام کا بنیادی موضوع اگرچہ مذہبی ہے لیکن ترقی یافتہ دور کے سلاموں میں ایسے اشعار بہ کثرت ملتے ہیں جن کا براہ راست تعلق نہ مذہب سے ہے نہ جذبہ عقیدت سے، اور نہ مدح اہلبیتؑ سے۔ سلاموں میں ایسے بےشمار اشعار ملتے ہیں جن کا واقعہ کربلا سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔

مذہبی شاعری میں سیاسی اور معاشرتی موضوعات کو پیش کرنے کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن متعدد شعرا اپنے عہد کے بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان شعرا نے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی صورت حال اور معاشرہ کی خوشحالی اور بدحالی کا نقشہ سلاموں میں کھینچا ہے۔

موجودہ زمانے میں سلام کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی تعریف سلام گوئی کے تمام ادوار کا احاطہ نہیں کرتی۔ ابتدائی دور کے سلام اصناف شاعری کی تقریباً تمام ہیئتوں میں ملتے ہیں۔

ترقی یافتہ دور سے پہلے منفردہ یا غزل کی ہیئت میں سلام گوئی کا رواج موجود تھا۔ لیکن منفردہ کی یہ ہیئت سلام گوئی کے لئے مخصوص نہیں ہوئی تھی۔ سلام کہنے کے لئے ہیئت کا انتخاب شاعر کی صوابدید پر منحصر ہوتا تھا۔

ترقی یافتہ دور سے پہلے منفردہ کی ہیئت میں ایک مکمل سلام درگاہ قلی خاں کا ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے یہاں دیگر ہیئتوں میں سلام کہے جانے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ [1]

شمالی ہند میں سلاموں کے ابتدائی نقوش علی جواد زیدی کی تحقیق کے مطابق محمد شاہ رنگیلے کے عہد

(ا) مرثیہ میں تمام اشعار پابند مربوط اور سلسلہ وار ہوتے ہیں۔ غزل میں ہر شعر مفہوم کے اعتبار سے منفرد اور الگ ہوتا ہے۔

سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں۔[۲] سلام گوئی کے لئے بطور صنف یہی زمانہ باضابطہ تشکیل اور تعین کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اگر چہ جنوبی ہند میں سلام گوئی کا رواج شمالی ہند سے پہلے موجود تھا۔لیکن صنف سلام کی باقاعدہ تشکیل کا سہرا شمالی ہند کے سر جاتا ہے۔اس نتیجہ کو نکالنے کے دو اسباب ہیں۔ایک یہ کہ دکن میں بقول چراغ علی:۔

''مرثیہ میں وہی سلام کہلاتا ہے جس کی ردیف میں سلام علیک، السّلام، مرحبا یا صلوٰت جیسے الفاظ ہوں۔'' [۳]

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ جنوبی ہند میں سلاموں کو امتیاز تب حاصل ہوا جب دکن نے شمالی ہند کے شعرا کے طرز کو اپنایا۔جیسے درگاہ قلی خاں۔اگر چہ جنوبی ہند کو اس صنف کی غیر شعوری نشو نما میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔لیکن باقاعدہ تشکیل، ارتقا اور ہیئت و موضوعات کے تعین کا اعزاز شمالی ہندوستان کو ہی حاصل ہے۔

شمالی ہندوستان میں دلی کے بعد لکھنؤ اس صنف کی ترقی اور عروج کا مرکز قرار پایا۔سلام کی صنف کی شہرت اور ایک وسیع حلقہ میں اس کی شناخت اور مقبولیت کو عام کرنے کا شرف بھی اسی خطہ کو حاصل ہے۔صنف سلام کی تعریف بھی عموماً اسی دور کے سلاموں کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔اگر چہ منقبتی سلاموں کی تعداد بھی کافی ہے۔لیکن زیادہ شہرت اور اہمیت رثائی سلاموں کو ہی حاصل ہے۔بیشتر تذکرہ نگاروں اور لغت نویسوں نے معمولی ردو بدل کے ساتھ سلام کو رثائی ادب کا ایک حصّہ قرار دیتے ہوئے تقریباً ایک جیسی تعریفیں کی ہیں۔

اسد اریب نے سلام کی تکنیک اور ہیئت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سلام کی تکنیک اور ہیئت وہی ہے جو غزل کی ہے۔ پہلے مطلع ہوتا ہے قافیہ اور ردیف کا التزام کیا جاتا ہے مقطع کا اہتمام ہوتا ہے۔غزل کی ساری تعریف اس پر ذرا سے تغیر

کے ساتھ پوری اترتی ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر اپنے
اندر ایک الگ مفہوم رکھتا ہے اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ
وہ اپنے ماقبل و مابعد سے منسلک ہو۔ اسی طرح سلام کے
اشعار ہیں کہ وہ مفہوم کے اعتبار سے الگ تھلگ بھی رہ سکتے
ہیں جس طرح غزل میں تسلسل عیب نہیں اسی طرح سلام میں
بھی نہیں۔ غزل کا رمزی اور کنائی انداز بیان اس کا ایک
وصف ہے جس میں گفتگو تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے کی
جاتی ہے۔ جہاں تک بھی ممکن ہو ایجاز سے کام لیا جاتا
ہے۔ یہی کیفیت سلام میں بھی ہوتی ہے۔ جس طرح غزل کے
مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑتی ہے۔ شاعر تعلّی کرتا ہے۔
فخر و مباہات سے کام لیتا ہے۔ سلام میں بھی یہ چھیڑ چھاڑ،
سخن گسترانہ باتیں اور تعلیاں ہیں''۔ ۴

''سلام ضروری نہیں کہ رقت اور گریہ و بکا کے اہتمام
کے لئے ہو۔ اس کو نہایت ہلکے پھلکے انداز میں بھی لکھا جاتا ہے
اور یہ بھی ہوتا ہے کہ بیان کی تاثیر سے مصائب کے ٹکڑوں پر زیا
دہ بکا ہو جائے۔ لیکن مجموعی ہیئت سے اس کی فضا پاکیزہ
خیالات، تزکیۂ نفس کے جذبات، سیرت و کردار کی تعمیر کرنے
والے بیان، ناپائیداری حیات کے اظہار اور اتباع سیرت
معصومین سے معمور ہوتی ہے''۔ ۵

علی جواد زیدی نے اردو میں سلام گوئی کی تاریخ کا مبسوط جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال
ہے کہ ''سلام کی صنف ان اصناف شعر میں ہے جو اردو میں پھلی پھولی۔ عربی میں متفرق اشعار جو
سلام سے موضوعاتی ربط رکھتے ہیں، اس زبان کے قصائد میں مل جائیں گے۔ لیکن ایک جداگا

نہ صنف کے اعتبار سے عربی میں وجود نہیں...........ایرانی فارسی گویوں کے یہاں سلام تلاش ہی سے ملتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں بھگتی تحریک اور عقیدت کی عام فضا سے متاثر ہو کر یہاں کے فارسی گویوں نے سلام کہے ہیں۔''٦

اگر چہ سلام کا ارتقا مرثیہ کی ایک ضمنی صنف کے طور پر ہوا۔ لیکن بعد میں صورت حال بہت بدل گئی۔ اب سلام مرثیہ کی ذیلی صنف شمار ہونے کے بجائے ایک مکمل اور مستقل ادبی صنف کا درجہ رکھتا ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے مرثیہ سے سلام کے امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سلام اس اعتبار سے مرثیہ پر تفوق رکھتا ہے کہ اس میں مرثیہ کے سارے موضوعات اور تمام اجزا اجمال کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ منظر نگاری، جنگ، رجز، شہادت اور بین وغیرہ کی مثالیں سلاموں میں بکثرت موجود ہیں۔ مگر خود مرثیہ سلام کے مقابلے میں محدود صنف نظر آتا ہے کہ اس کا دامن سلام کے بعض موضوعات سے یکسر خالی ہے''۔٧

ترقی یافتہ دور کے سلاموں سے پروفیسر شافع قدوائی کے بیانات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ مرثیہ کے موضوعات ایک خاص نکتہ کے اردگرد ہی گردش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہر طرح کے رثائی اور غیر رثائی موضوعات کی شمولیت کی گنجائش سلاموں میں پوری طرح پائی جاتی ہے۔ نظیر الحسن فوقؔ نے سلاموں کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''جس طرح غزلوں میں عشقیہ اور رندانہ مضامیں کے علاوہ بعض عام اخلاقی اور تمدنی مضامین بھی نظم کیے جاتے ہیں۔ اس طرح سلاموں میں مرثیت سے علیحٰدہ ہو کر مختلف جذبات انسانی مثلاً حسرت وغم صبر و رضا، قناعت و توکل، یاس و نا امیدی حب وطن، قومی ہمدردی، بے ثباتی دنیا،

> شکایت ارباب زمانہ، یادِ ایام شباب اور اس کے سوا دیگر
> مختلف مضامین کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن کو اگر سلام
> سے علیحدہ کردیں تو غزل کے اشعار میں مل سکتے ہیں۔'' [۸]

لیکن سلام کے دامن میں یہ وسعت بہت بعد میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی دور کے سلاموں کے مقاصد اور ان ساخت، عروضی ترکیب، موضوعاتی تنوع اور مختلف ہیئتوں کا ذکر کرتے ہوئے فضل امام نے لکھا ہے:

> ''ابتدا میں سلام کا مقصد بزرگان دین کی روحوں پر براہ راست
> درود و سلام بھیجنا ہوتا تھا اور یہ تخصیص نہیں برتی جاتی تھی کہ سلام
> غزل کے طور پر ہی لکھا جائے۔ لہٰذا متقدمین کے دواوین میں جو
> نمونے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں منفرد اشعار کے سلاموں
> کے علاوہ مثلث یا مربع ہیئت کے بھی سلام موجود ہیں۔'' [۹]

سلاموں کی عروضی ہیئت کے علاوہ طریق اظہار میں تبدیلی اور صنف سلام کی تشکیل میں استحکام اور اس کی اصطلاحی علامتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فضل امام نے لکھا ہے:

> ''نئے ادبی شعور اور عزاداری کے بدلتے ہوئے
> تقاضوں نے سلام کی عروضی ترکیب و ہیئت، نفس مضمون کی
> ترکیب، تعمیر و تشکیل میں بعض اہم اور ناگزیر تبدیلیوں سے
> کام لیا اور نتیجہ کے طور پر خطابیہ انداز داخل ہوا اور سلام کو
> شعرا اہل مجلس کو خطاب کرنے کے لئے سلام کی اصطلاح
> میں مجرائی، مجرائی اور سلامی سے خطاب کرنے لگے''۔ [۱۰]

ہیئت اور موضوعات:۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اردو میں رثائی شاعری کی ابتدا سے ہی مختلف ہیئتوں میں سلام کہے جانے لگے تھے۔ اردو کی دیگر اصناف شاعری کی طرح سلام گوئی کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔ شروع میں سلام کئی ہیئتوں میں نظم کئے گئے۔ رفتہ رفتہ منفرد ہ کی ہیئت سلاموں کے لئے مخصوص ہوگئی۔ اس کے بعد سلاموں کے موضوعات و مضامین میں بھی تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ شعرا نے مرثیہ اور غزل کے ملے جلے رنگ کو سلاموں میں برتا۔ اظہار خیال کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے، جس سے اس صنف میں تنوع اور دلچسپی پیدا ہوئی۔

علی جواد زیدی نے اپنی کتاب ''جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی'' میں پناہ علی بیگ افسردہ اور میر اکبر علی مقبل کی سلام گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''غالباً وہ پہلے سلام گو ہیں جنھوں نے سلام کے دو دیوان ''باب السلام'' اور ''دارالسلام'' کے نام سے مرتب کیے۔ ان میں ۱۱۲۹ سلام یکجا ہیں۔ حمد و نعت و منقبت کے علاوہ عظمت غم، شجاعت، شوق زیارت، فراق وغیرہ مضامین کا اضافہ اور مضمون آفرینی اور صنعت نگاری کی کوشش صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ مرثیوں میں رجز اور جنگ کے بھی نقوش ملتے ہیں۔ میر اکبر علی مقبل نے سلاموں کا ایک ردیف وار ''دیوان سلام'' مرتب کیا تھا۔''[۱۱]

مرثیہ اور سلام میں ہیئت کے فرق کو واضع کرتے ہوئے زیدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''مختصر یہ کہ پہلے مرثیہ بہ شکل سلام ہوتا تھا۔ اب سلام نے باضابطہ ایک الگ صنف کی صورت اختیار کی اور اس کو وہ قبول عام ملا کہ مقبل اور افسردہ کے سلام کے مستقل دو دو اوین مرتب کیے''۔ [۱۲]

مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے میدان میں جو ہوا بدلی وہ میر خلیق کے زمانہ سے بدلی۔ پہلے اکثر مرثیے چومصرعے ہوتے تھے۔ ہر چار مصرع کے بعد قافیہ۔ وہ انداز موقوف ہوا۔ ایک سلام غزل کے انداز میں۔ اور مرثیہ کے لئے غزل کا طریقہ آئین ہوگیا۔ وہ سوز اور تحت لفظ دونوں طرح پڑھا جاتا تھا۔ اور جو کچھ غزل مستزاد کے اسلوب پر کہتے تھے وہ نوحہ کہلاتا تھا۔ اسے سوز ہی میں پڑھتے اور یہ طریقہ اب تک جاری ہے۔ میر خلیق اور ان کے بعض ہم عصر جو سلام یا مرثیے وغیرہ کہتے تھے۔ ان میں مصائب اور ماجرائے شہادت کے ساتھ فضائل اور معجزات کی روائتیں اس سلاست اور سادگی وصفائی سے نظم کرتے تھے کہ واقعات کی صورت نظروں کے سامنے پھر جاتی تھی اور دل کا درد آنکھوں سے آنسو ہوکر ٹپک پڑتا تھا۔'' ۱۳؎

عام طور سے سلام کی اصطلاح ایک ایسے شعری سانچے کے لئے استعمال ہوتی ہے جس میں غزل کی عروضی ہیئت میں رسول اکرم ﷺ، ائمہ اطہارؑ اور اہلبیتؑ کی سیرت اور کارنامے بیان کیے جائیں۔ واقعہ کربلا اور اس کی مرکزی شخصیت امام حسینؑ اور ان کے افراد خاندان اور رفقا کا تذکرہ واقعات کے رثائی تناظر میں کیا جائے۔ اردو کے علاوہ دوسری کسی زبان میں سلام ایک جدا گانہ صنف کے طور پر رائج نہیں۔ اردو میں سلام گوئی کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے شارب ردولوی نے لکھا ہے:

''مرثیہ کی تو رفتہ رفتہ ایک ہیئت بنتی گئی اور بالآخر مسدس کی شکل میں اردو کی عظیم بیانیہ شاعری بن کر ہمارے سامنے آیا اور جو شکل ابتدائی مرثیوں کی صورت میں غزل کی ہیئت میں ظاہر ہوئی تھی اس نے سلام کی شکل اختیار کر لی اس طرح سلام کی تاریخ کی کڑیاں مرثیے کی ابتدا سے ملی ہوئی ہیں''۔ ۱۴؎

لیکن کچھ حقائق شارب ردولوی کے بیانات اور اندازوں سے مختلف بھی ہیں۔ بیجاپوری سلطنت کے مشہور مرثیہ گو مرزاؔ نے سلام کے عنوان سے شعر کہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کے زمانہ میں سلام ایک صنف کے طور پر وجود میں آچکا تھا۔ صرف منفردہ مرثیوں کو ہی سلام کا

عنوان نہیں دیا جاتا تھا۔ مرزؔا کے سلام کا نمونہ یہ ہے:

اے حسینؑ علیؑ سلام علیک	شاہے جملہ ولی سلام علیک
جد ہے تیرا محمدؐ مرسل	سرورانبیا سلام علیک
فاطمہؓ ھور علیؑ کے دربار کا	توں دربے بہا سلام علیک
سروردیں حسنؑ کا توں بازو	اے دو جگ پیشوا سلام علیک
ہے ترے نام پر جنم مرزا	جان و دل سوں فدا سلام علیک ۱۵؎

سلام کے مذکورہ بالا اشعار بیجاپوری سلطنت کے علی عادل شاہی دور کے مرزؔا کے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے علی عادل شاہی مرزؔا کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر اس کے مرثیوں کی عدم دستیابی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مگر افسوس تیقن کے ساتھ اس کے مرثیے پیش نہیں کیے جا سکتے۔ مرزا تخلص کے سولہ مرثیے اڈنبرا میں ہیں۔ ان میں سے نہیں معلوم گولکنڈہ کے مرزا کے کتنے مرثیے ہیں اور بیجاپوری کے کتنے۔ چونکہ دونوں کا زمانہ قریب قریب ایک ہے اس لئے ان کے تمیز کرنے میں بڑی دشواری ہے۔ بریں ہمہ ایک مرثیے کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ جو بعض اندرونی شہادتوں کے لحاظ سے بیجاپور کے مرزا کا مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔''۱۶؎

نصیرالدین ہاشمی نے بیجاپوری مرزؔا کی سلام گوئی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ اس کے اشعار کا کوئی ایسا نمونہ ہے جو تقی عابدی کے نقل کردہ سلام کے اشعار سے مطابقت رکھتا ہو۔ تقی عابدی نے اپنی کتاب میں نقل کردہ مرزؔا کے سلام کے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی دور کے مرزؔا کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے:

''اس تخلص کے دکن میں دو شخص گذرے ہیں ایک

قطب شاہی دوسرے عادل شاہی۔ یہاں ہم کو قطب شاہی مرزؔا سے بحث ہے۔'' 17

نصیرالدین ہاشمی نے مرزا کے سلام کا نمونہ نقل کیا ہے۔

اے شہ عالی مقام شاہ سلام علیک — ہر دو جہاں کے امام شاہ سلام علیک

مومنوں کے من تمام شاہ پہ بھیجو سلام — صدق سوں ہر دم مدام شاہ سلام علیک

اے شہ دیں شیر نر دھر تو کرم کی نظر

لطف سوں مرزا او پر شاہ سلام علیک 18

قطب شاہی مرزؔا کے بارے میں اسپرنگر نے لکھا ہے:

''مرزؔا ، ابو القاسم سلطان ابوالحسن قطب شاہ کے درباری تھے۔ جب ان کے آقا قید کر لیے گئے تو وہ عبداللہ گنج کے قریب حیدرآباد میں فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے''۔

(بحوالہ تذکرہ قائم:٢٦٨)

نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب میں قطب شاہی مرزؔا کے مرثیوں کا انتخاب بطور نمونہ درج کیا ہے۔

دونوں مرزاؤں کے سلام کے نمونہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی دیگر اصناف کی طرح سلام گوئی کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی اور سلام کی تمام ہیئتوں میں منفردہ کی ہیئت کو دیگر ہیئتوں پر غلبہ حاصل رہا، یہ بات ان دونوں شعرا (مرزؔا) کے سلام کی ہیئتوں سے ظاہر ہے۔

شارب ردولوی نے مرثیوں میں ہیئت کے تجربے کے زیر بحث ہاشم علی 19 برہانپوری (وفات ١١٦٩ھ۔١٧٥٦ء) کی مرثیہ گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''مرزؔا کے بعد ان مرثیہ گویوں میں اہم نام ہاشم علی برہان پوری کا آتا ہے جنہوں نے مرثیہ کی ہیئت میں نئے تجربے کیے۔ ہا

شم علی کا زمانہ سترہویں صدی کا آخر اور اٹھارہویں صدی کا نصف اوّل ہے۔ ڈاکٹر زور کے مطابق ہاشم علی کے مجموعہ مراثی، دیوان حسینی، میں ۲۳۸ مرثیے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ مرثیے منفردہ، مربع اور مربع ترجیع بند کی شکل میں ہیں۔'' (مرثیہ اور مرثیہ نگار۔ص:۲۹)

مسیح الزماں نے ہاشم علی کی سلام گوئی کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''دیوان حسینی میں زیادہ تر مرثیے غزل کی شکل میں ہیں۔ سلاموں کی تعداد بھی کافی ہے''۔(اردو مرثیے کا ارتقا۔ص:۷۰)

مسیح الزماں کے قول سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کوئی مرثیہ منفردہ یا غزل کی ہیئت میں ہونے سے سلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اسی شاعر نے منفردہ مرثیوں کے ساتھ سلام کے عنوان سے علٰحدہ طور پر بہ حیثیت ایک مخصوص صنف کے سلام کے شعر کہے ہیں۔

فضل امام کی تحقیق کے مطابق سلام گوئی کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ولؔی دکنی کے سلام کا نمونہ اپنی کتاب میں درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ابتک کی تحقیق کے مطابق اردو میں سلام نگاری کا سلسلہ بھی جنوبی ہند سے شروع ہوتا ہے اور ولؔی دکنی کے کلیات میں اس کے نمونے ملتے ہیں''۔[۲۰]

فضل امام کی یہ بات تو درست ہے کہ ''اردو میں سلام نگاری کا سلسلہ بھی جنوبی ہند سے شروع ہوتا ہے۔'' لیکن ولؔی دکنی کے سلام کا نمونہ ان کے کلیات میں پائے جانے کی بات درست نہیں۔ غالبًا انھوں نے کسی ثانوی ماخذ کے سہارے یہ بات لکھی ہے۔ کیونکہ ولؔی کے کلیات میں سلام کے مذکورہ اشعار موجود نہیں ہیں۔ اگر چہ یہ اشعار نصیر الدین ہاشمی کی کتاب ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' میں ضرور ہیں۔ لیکن انہوں نے ان اشعار کو مرثیہ کے عنوان سے درج کیا ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ ولؔی دکنی سے پہلے قطب شاہی مرزؔا کے یہاں سلام کے مصدقہ

نمونے پائے جاتے ہیں ۔نصیرالدین ہاشمی نے یورپ میں دکنی مخطوطات کے حوالہ سے ولؔی کے مذکورہ اشعار کو ولؔی کا مرثیہ ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ولؔی کے مرثیے اس کے دیوان میں نہیں ہیں بلکہ
اڈنبرا کے مرثیوں کی بیاض میں شامل ہیں ۔
ولی کے دیوان میں کوئی مرثیہ یا سلام نہ ہونے سے قیاس
ہوتا ہے کہ غالباً اس نے اس صنف میں طبع آزمائی نہیں کی ۔مگر
تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے ۔
افسوس کہ ہم نے ولی کے مرثیے مکمل نوٹ نہیں کیے چند
شعر جو نوٹ کیے ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں ۔ولؔی کے مرثیے
غزل نما ہیں ۔'' ۲۱

مرثیہ کے چھ اشعار نقل کرنے کے بعد ہاشمی نے ان تین اشعار کو نقل کیا ہے جنہیں علی جواد زیدی، فضل امام اور تقی عابدی نے سلام سے موسوم کیا ہے، لیکن ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ ولؔی کے وہ اشعار جنہیں ان تینوں محققین نے نقل کیا ہے اس طرح ہیں:

اس نور مصطفیٰؐ پر بولو سلام یاراں	محبوب مرتضیٰؑ پر بولو سلام یاراں
اس پاک پارسا پر حیدر کے دل ربا پر	اس لعل بے بہا پر بولو سلام یاراں
یو جی ولؔی فدا کر اس شاہ کربلا پر	اس لائق ثنا پر بولو سلام یاراں ۲۲

ولؔی تخلص ۲۳ کے دکن میں ایک ہی وقت میں دو شعرا گذرے ہیں ۔ایک اورنگ آباد کا باشندہ تھا جو بقول محمد حسین آزؔاد اردو شاعری کے باوا آدم سے ملقب کیا گیا ہے۔ دوسرے ولؔی ویلوری ۲۴ مدراس علاقہ کا باشندہ تھا جو پیشہ سے فوجی ملازم اور مرثیہ گو شاعر تھا۔ ولی ویلوری نے ملا حسین کاشفی کی کتاب روضۃ الشہدا کا مثنوی کی ہیئت میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ چونکہ ولؔی دکنی کی شہرت غزل گو کی حیثیت سے تھی اور ولؔی ویلوری کی مرثیہ گو کی حیثیت سے، اس لئے یہ شبہ ہوتا

تھا کہ سلام کے جن اشعار کو محققین نے وَلی یا وَلی دکنی کے حوالہ سے نقل کیا ہے وہ ممکن ہے ولی ویلوری کے ہوں اس شبہ کو مزید تقویت اس وجہ سے ہوتی کی علی جوادزیدی نے وَلی کے ساتھ دکنی ملحق نہیں کیا ہے۔ لیکن نصیرالدین ہاشمی کی وضاحتوں سے تمام شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہےاور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ اشعار وَلی دکنی کے ہی ہیں۔ ۲۵؎

نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ ولی دکنی کے دیوان کے پندرہ نسخے ہیں ۲۶؎۔ اس لئے ممکن ہے ولی کے سلام کے یہ شعر مذکورہ محققین کو کسی نسخے میں سلام کے عنوان سے ملے ہوں۔ کیونکہ بقول نصیرالدین ہاشمی:

> ''ایک ہی کتاب کے متعدد نسخے جن سے مقابلہ کر کے اختلاف معلوم کیے جا سکتے ہیں''۔ دیوان وَلی کے پندرہ نسخوں کے علاوہ گلشن عشق کے چھ نسخے، پھول بن کے تین نسخے اوراسی طرح دیگر کتابوں کی حالت ہے۔ ۲۷؎

وَلی دکنی کے علاوہ دکن کے دوسرے شعرا کے یہاں بھی سلام سے صنفی مناسبت رکھنے والے ایسے رثائی اشعار ملتے ہیں جنہیں صنف سلام کا ابتدائی نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ یہ اشعار اس دور کی تخلیق ہیں جب دکن میں سلام گوئی کو ایک علیٰحدہ صنف کی حیثیت سے شناخت حاصل نہیں ہوئی تھی پھر بھی ان اشعار میں نہایت موزوں، منضبط، مربوط اور مرتب انداز میں لفظ ''سلام''، ''سلام علیک'' اور ''درود پڑھو'' کی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔ جو بعد میں صنف سلام کی شناخت قرار پائے۔

دکن میں سلام کو ایک مکمل اور مستقل صنف کی حیثیت سے درگاہ قلی خاں کے زمانے میں شناخت حاصل ہوئی۔ مرقع سخن میں میر سعادت علی رضوی نے لکھا ہے کہ درگاہ قلی کے دکنی زبان میں مرثیوں اور سلاموں کے علاوہ دو عربی اور ایک فارسی سلام بھی ہیں۔ درگاہ قلی کی شاعری میں زبان کے ترقی یافتہ آہنگ کی جھلک ہے۔ ان کے اشعار میں آمد ہی آمد نظر آتی ہے۔ شستہ الفاظ اور برجستہ ترکیبوں نے درگاہ کے اشعار کی دلچسپی اور دل نشینی کو اور بڑھا دیا ہے۔

درگاہ کے زمانے تک مرثیوں کے لئے کوئی خاص شکل معین نہیں ہوئی تھی ۔مسدس کی ہیئت میں مرثیہ لکھے جانے کی ابتدا درگاہ اوران کے ہم عصر سوداؔ سے ہوئی ۔مسدس کے ابتدائی نمونے اسی دور میں ملتے ہیں۔اس سے پہلے دکن اورشمالی ہند میں عموماً منفردہ اورمربع کی ہیئت میں مرثیہ لکھے جاتے تھے۔بعض مرثیہ گومخمس اورمثمن ،دہرہ بنداورترجیع بند کی ہیئت میں مرثیے لکھتے تھے۔ درگاہ قلی کے مرثیے بھی مختلف ہیئتوں میں ہیں۔درگاہ کے سلاموں کی اپنی ایک امتیازی روش ہے۔ مسیح الزماں نے درگاہ قلی کی سلام گوئی کا ذکر کیا ہے۔لیکن سلام کا نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ میر سعادت علی رضوی نے درگاہ کا ایک سلام نمونہ کے طور پر درج کرتے ہوئے ان کی سلام گوئی کے اوصاف اس طرح قلم بند کیے ہیں:

''نواب درگاہ قلی کے سلاموں کا موضوع بجز ہدیہ درودوسلام کے اور کچھ نہیں۔کہیں مجموعی حیثیت سے محمدؐ وآل محمدؐ پر درود بھیجتے ہیں اور کہیں نام بہ نام چودہ معصومین کی خدمت میں سلام کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔کسی سلام میں واقعات کربلا کا ذکر نہیں اور نہ کسی کی شہادت کا حال درج ہے۔بلکہ ایک قسم کی نعتیہ نظم ہے جس میں محمدؐ وآل محمدؐ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔۲۸؎

درگاہ قلی خاں کے سلام کانمونہ ملاحظہ ہو:

ادب سے فاتحہ پڑھ کر کہو نبیؐ پہ سلام
نبیؐ کے قوت بازو علیؑ ولی پہ سلام

جناب اقدس خاتون حشر پر صلوٰت
شہید جرعہ زہر ہلا ہلی پہ سلام

لڑے ہیں جا کے ہزاروں سیں باتن تنہا
شہ سریر شجاعت مہا بلی پہ سلام

یتیم و بیکس و مظلوم عابد و سجادؑ
وہ نور چشم و جگر گوشئہ علیؑ پہ سلام

محیط علم لدنی محمدؐ باقرؑ
پناہ روز قیامت کی کھلبلی پہ سلام

امام جعفر صادق منور ملت
شعاع آئینہ دین صیقلی پہ سلام

امام موسیٰ کاظم قسیم نار و نعیم
بہار نادعلی و سیخلی پہ سلام

امام ثامن ضامن گل ریاض رضا
شہ سریر ریاضت زکی رضی پہ سلام

امیر ملک سخاوت شہ جواد و کریم
تقیؑ و متقی و مہدیٔ زکی پہ سلام

گل حدیقۂ احساں امام ہر دو جہاں
بہار باغ ولایت علیؑ نقی پہ سلام

حسام لشکر و صمصام خوں فشانِ مصاف
ہژبر بیشہ اسلام عسکری پہ سلام

ادب سے بندہ درگاہ بھیجتا ہے مدام
جناب اقدس اثنا عشر ولی پہ سلام ۲۹

مسیح الزماں نے درگاہ قلی کی سلام گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سر سالار جنگ کے کتب خانہ میں ان کے انیس مرثیے اور اکیس سلام ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ گوئی کے میدان میں صرف حصول ثواب کی نیت سے قدم نہیں رکھا بلکہ اس میدان میں اپنی طبیعت کا زور دکھایا۔ حسن اتفاق سے ان مرثیوں پر سال تصنیف پڑا ہوا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۳ء سے لیکر ۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء تک میں لکھے گئے ہیں ۔۔۔۔۔ سلاموں میں دس مربع کی شکل میں ہیں۔'' ۳۰

'مرقع سخن' میں میر سعادت علی رضوی کے مضمون سے مسیح الزماں کے کچھ دعوؤں کی تصدیق ہوتی ہے اور کچھ بیانات میں فرق پایا جاتا ہے۔ مرثیہ اور سلام کی تعداد کے بارے میں سعادت علی رضوی لکھتے ہیں:

''زیرنظر بیاض میں کل (۲۸) مرثیے ہیں جو (۸۴۷)
اشعار پر مشتمل ہیں اور (۲۲) سلام ہیں جن میں (۴۳۶) اشعار
ہیں۔''[۳۱]

نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' میں دکن کے ایسے کئی شعر کا ذکر کیا ہے جن کے مرثیے سلاموں سے ہیئتی اور موضوعاتی مناسبت رکھتے ہیں۔ اور بعض شعرا کے کلام باضابطہ سلام کے عنوان سے موجود ہیں۔ ہاشمی نے ذوقی کے سلام کے عنوان سے کہے گئے تین شعر نقل کیے ہیں۔ ان اشعار کا طرز ولی دکنی کے سلام کے طرز سے کافی قریب ہے۔ ان اشعار کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے انھیں خود سلام کا عنوان دیا ہے۔ جبکہ ولی کے وہ اشعار جنہیں علی جواد زیدی، فضل امام اور تقی عابدی نے سلام سے موسوم کیا ہے، خود ولی نے ان اشعار کو مرثیہ کا عنوان دیا ہے۔

ذوقی کے سلسلہ میں نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''ذوقی کے مرثیے اڈنبرا کے مجموعہ میں موجود ہیں
۔۔۔۔۔ان کے مرثیے اکثر غزل نما ہیں۔ ان کی زبان تو
صاف ہے مگر اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔

سلام کا نمونہ:۔

شمس الضحیٰ پر سلام بولو　　بدر الدجیٰ پر سلام بولو
شیر خدا پر سلام بولو　　آل عبا پر سلام بولو
ذوقی کہتا ہے صبح و مسا میں
اس رہنما پر سلام بولو ''۔[۳۲]

ولی اور ذوقی کے علاوہ دکن میں ایسے کئی شعرا گذرے ہیں جن کے مرثیے کے اشعار سلاموں سے صنفی اور ہیئتی مناسبت رکھتے ہیں۔ ان میں سید، علی، عترت، عسکری، اور عزلت قابل

ذکر ہیں۔ان شعرا کے مراثی کو بعض محققین نے سلاموں کی ابتدائی صورت سے تعبیر کیا ہے۔
سیدؔ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو: ۳۳؎

اوس خاصہ خدا پر بولو سلام یاراں — اوس لائق ثنا پر بولو سلام یاراں
اوس ذات مصطفےٰ پر والیل اذا سجا پر — والشّمس والضّحیٰ پر بولو سلام یاراں
اوس فیض جاوداں پر فیاض موماں پر — سلطان دو جہاں پر بولو سلام یاراں
اوس ہادی ہدیٰ پر اس پیر مقتدیٰ پر — اوس کامل الدعا پر بولو سلام یاراں

خالق کے طالباں پر احمد کے نائباں پر
سیدؔ کے صاحباں پر بولو سلام یاراں ۳۴؎(اڈنبرا)

اسی طرح علیؔ کے مرثیہ کے اشعار میں بھی سلام کی صنفی اور ہیئتی جھلک دیکھی جا سکتی ہے
۔علی جواد زیدی ۳۵؎ نے ان اشعار کو بھی سلام کے زمرے میں شامل کیا ہے جن کے ردیف درود
یا فاتحہ ہے۔علیؔ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

اے دوستان امام الم پر کہو درود — بحر سخا و کان کرم پر کہو درود
ناحق کیا شہید یہ زہر و دگر بہ تیغ — دو کشتگان جور و ستم پر کہو درود

کرتا ہے صبح و شام علیؔ مرثیہ رقم
اس نکتہ دان لوح و قلم پر کہو درود ۳۶؎ (اڈنبرا)

عترتؔ کے اشعار بھی ولیؔ دکنی کے طرز سے خاصے قریب ہیں۔

اس شاہ رہنما پر بولو سلام یاراں — اس قبلہ دعا پر بولو سلام یاراں
محبوب مرتضیٰ پر زہرہ کے دل ربا پر — حیدر کے مہ لقا پر بولو سلام یاراں

اس معدن صفا پر آئینہ خدا پر
عترتؔ سکے گدا پر بولو سلام یاراں ۳۷؎ (اڈنبرا)

عسکریؔ کے مرثیے کا آہنگ سلاموں کے قدیم طرز سے بڑی حد تک مناسبت رکھتا ہے

اول اس نور خدا کوں جا صبا پہونچا سلام   لائق حمد وثنا کوں جا صبا پہونچا سلام
عسکری ہیں عالم علم لدنی با کمال   عارفاں کے تاج کوں جا صبا پہونچا سلام

ہاشمی نے عزلتؔ کو دکن اور شمالی ہند کا مشہور شاعر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ تقریباً ہر تذکرہ نویس نے ان کا ذکر کیا ہے۔ عزلتؔ ۱۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ عزلتؔ کے مرثیے کا ایک شعر جس میں قدیم طرز کے سلاموں کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

روح الامیں کوں حق نے کہا کربلا کوں جاؤ
میرا سلام فاطمہ کے لال کوں سناؤ ۳۸

دکن کے ایک شاعر یتیم احمد ہیں ان کے سات مرثیے اڈنبرا میں ہیں ہیں۔ ان مرثیوں میں کل ایک سو ساٹھ شعر ہیں۔ ان میں سے دو مرثیے امام حسینؑ کی مدح میں قصیدے ہیں دو مرثیوں میں آپ کے خاندان کی تکالیف اور مصائب و پریشانی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مرثیہ کے تین شعر جو سلام سے مناسبت رکھتے ہیں پیش کیے جاتے ہیں۔

اے تو سرِ رواں سلام علیک   گل باغ جناں سلام علیک
شاہ کشورستاں سلام علیک   قائل گمرہان سلام علیک ۳۹

تذکرہ شعرائے دکن میں معجزؔ تخلص کے شاعر کا ذکر ہے۔ اس کے سلام کا نمونہ یہ ہے۔

نبیؐ کے نور نین پر کہو درود و سلام   علیؑ کے سرو چمن پر کہو درود و سلام
اسیر درد و محن پر کہو درود و سلام   شہید سرخ کفن پر کہو درود و سلام
ہمیشہ مصرع معجزؔ رہو از یں غم ناک

شہ زمین و زمن پر کہو درود وسلام ۴۰؎

دکن کے ایک اور شاعر مسیح الدین کے سلام کا نمونہ یہ ہے۔

اے محباں شاہ سرور پر سلام   دوشہاں امت کے رہبر پر سلام

یہ مسیح الدین قنبر کا غلام

پھر کہے گا شاہ اکبر پر سلام

نصیرالدین ہاشمی نے ایک مسکینؔ دکنی کا بھی ذکر کیا ہے جس کے سلام کا نمونہ یہ ہے۔

جب سوں آغاز کیا حق نے ہے دستور سلام   تب سوں اول ہے محمدؐ پہ ہی منظور سلام

وہ محمدؐ کہ ہنوز آدم و حوا بھی نہ تھے   اوسکوں اول سیتے پہونچا تا تھا با نور سلام

کاشکہ چہاردہ معصوم کی سب کے طفیل

ہوئے اس عاصی مسکینؔ کا منظور سلام ۴۱؎

دکن کے ایک اور شاعر مدحی کے سلام کا نمونہ یہ ہے۔

یاراں دو جگ کے شاہ پہ صلوات سب کہو   معنی لا الہٰ پہ صلوات سب کہو

بھیجے درود مدحی مداح دمبدم

ان سارے قبلہ گاہ پہ صلوات سب کہو ۴۲؎

اسپرنگر نے ایک دکنی شاعر ندا کا ذکر کیا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

اول اس محبوب رب العالمین او پر سلام   اس حبیب اللہ ختم المرسلین او پر سلام

خشک لب خستہ جگر تشنہ دہن مغموم جاں   سر بریدہ کشتۂ شمشیر کیں او پر سلام

بعد ازاں کہہ اے نداؔ ہر روز و شب دل سے مدام

شاہ کے قبہ مبارک اور زمیں او پر سلام ۴۳؎ (اڈنبرا)

نصیرالدین ہاشمی نے اڈنبرا کے کتب خانہ کے حوالہ سے نعیمؔ دکنی کے سلام کے تین شعر نقل کیے ہیں۔

شہ کئیں صبا توں جد کو میرا سلام کہنا — بے دفن و بے کفن کا جا کر پیام کہنا

سر کاٹ ظالموں نے تن سے جدا کیا ہے — سر تو چلا سفر کوں تن کا مقام کہنا

تیرے نعیمؔ دل پر ہے نقش بندگی کا

کہتا ہے دو کہہ سیں رو رو شہ کا غلام کہنا

ان تمام شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہی سلام کہے گئے۔ اور اردو کی دیگر اصناف شاعری کی طرح سلام گوئی کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔

انیسؔ و دبیرؔ کے عہد تک سلاموں میں سلامی، مجرایا مجرئی کی طرح کا کوئی لفظ ''سلام'' کی شناخت کے لئے لانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لیکن انیسؔ و دبیرؔ کے عہد سے یہ طریقہ تقریباً متروک ہو گیا۔ اُس قدیم طرز اور ہیئت کی وضاحت کرتے ہوئے فضل امام نے لکھا ہے:

> ''شروع میں کافی عرصہ تک سلام میں لفظ ''سلام'' کا استعمال بھی روا رہا۔ کبھی یہ ردیف اور کبھی قافیہ کی صورت میں مروج تھا۔ بعد میں اس مروج انداز میں تبدیلی واقع ہوئی اور غزل کی طرح لکھا جانے لگا۔'' ۴۴ؔ

سلام کے موضوعات و مضامین کی تفصیل بیان کرتے ہوئے امداد امام اثرؔ نے لکھا ہے:

> ''عموماً سلام میں واقعۂ کربلا و شہادت امیر المومنینؑ و شہادت امام حسنؑ و مصائب حضرت خاتون جنت و رحلت حضرت رسالتمآب صلواۃ اللہ وسلامہٗ علیہم الیٰ یوم القیامہ کے مضامین داخل رہتے ہیں۔ اور بھی دیگر امور الم انگیز و حسرت خیز جو خاندان پیغمبر خدا صلعم سے متعلق ہیں، اندراج پاتے ہیں۔'' ۴۵ؔ

آثر کی مذکورہ بالا تعریف کی روشنی میں ترقی یافتہ دور کے سلاموں کا جائزہ لینے پر یہ تعریف جزوی طور پر صادق آئے گی۔ کیونکہ ترقی یافتہ دور کے سلاموں میں ایسے اشعار بہ کثرت مل جائیں گے جن کا تعلق براہ راست ان بزرگوں سے نہیں ہے۔ شاید اس بات کا احساس آثر کو بھی تھا اسی لئے انیس اور مونس کی سلام گوئی کے حوالے سے آگے لکھا ہے کہ:

''میر انیس و مونس کے بہت سے ایسے اشعار سلام ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جائیں تو بے موقع اور بے محل معلوم نہ ہوں گے''۔ ۴۶

آثر نے بہت احتیاط سے کام لیتے ہوئے سلاموں کے اس پہلو کو انیس و مونس تک محدود رکھا ہے۔ کیونکہ ان دوشعرا کے علاوہ کسی شاعر کے سلام میں تغزل کا اثر اتنا حاوی اور جلی نہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جائیں تو بے موقع اور بے محل معلوم نہ ہوں۔

صاحب مہذب الغات نے بھی سلاموں کی تعریف کو رثائی موضوعات تک محدود رکھا ہے۔ ان کے خیالات سے آثر کی ابتدائی تعریفوں کی تصدیق ہوتی ہے اور صنف سلام کے واجبی موضوعات کے حدود کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ردیف وقوافی کی پابندی کے ساتھ غزل کی طرز پر واقعات کربلا اور فضائل ومصائب سید الشہداء حضرت امام حسینؑ سے متعلق اشعار کو سلام کہتے ہیں۔

صاحب مہذب اللغات نے فرہنگ آصفیہ کے حوالہ سے سلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سلام اس نظم کو کہتے ہیں جو مرثیہ، رباعی، قطعہ، غزل یا قصیدے کے طرز پر ہو اور اس کے مطلع یا اوّل شعر میں لفظ مجرا، سلام، مجرائی یا سلامی لایا جائے تو اسے مجرا یا سلام کہتے ہیں۔'' ۴۷

چراغ علی نے دکنی مرثیوں میں سلام کی الگ شناخت کرنے کے لئے جن علامتوں کی نشاندہی کی ہے ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

چراغ علی نے مشتاقؔ، احمدؔ، روحیؔ اور دردیؔ کے رثائی کلام سے پانچ سلاموں کے نمونے درج کیے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے تین ایسے مرثیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی سرخی ''واویلا'' ہے۔ یہ مرثیے غواصیؔ، مومنؔ اور عشقیؔ کے ہیں جنھیں چراغ علی نے رثائی شاعری کا ایک الگ سانچہ بتایا ہے اور انھیں ''واویلا'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔

اسد اریب نے سلام کی تکنیک اور ہیئت کو غزل سے مشابہ قرار دیتے ہوئے اپنی کتاب ''اردو مرثیے کی سرگذشت'' میں لکھا ہے:

> ''سلام کی تکنیک اور ہیئت وہی ہے جو غزل کی ہے۔ پہلے مطلع ہوتا ہے۔ قافیہ اور ردیف کا التزام کیا جاتا ہے، مقطع کا اہتمام ہوتا ہے۔ غزل کی ساری تعریف اس پر ذرا سے تغیر کے ساتھ پوری اترتی ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک الگ مفہوم رکھتا ہے اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اپنے ماقبل و مابعد سے منسلک ہو۔ اسی طرح سلام کے اشعار اس کہ وہ مفہوم کے اعتبار سے الگ بھی رہ سکتے ہیں''۔ ۴۸

ہیئت کے تعلق سے اسد اریب کی تعریف کا اطلاق صرف ترقی یافتہ دور پر ہوگا۔ ابتدائی دور کے سلاموں کی ہیئت غزل کی ہیئت کے ساتھ مخصوص نہیں تھی۔ سلام کی صنف کے ساتھ ہیئت کی یہ تخصیص متوسط اور ترقی یافتہ دور میں ہوئی۔ علی جواد زیدی نے اپنی کتاب ''انیس کے سلام'' میں اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''ابتدائی دور کے سلام صرف غزل اور قصیدے کی ہیئت یعنی منفردہ کے پابند نہیں تھے۔ مثلث، مربع اور ترکیب بند کی ہیئتوں میں بھی متقدین کے سلام دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن

متوسط دور تک آتے آتے منفردہ یا غزل کی ہیئت تقریباً مسلّم
ہو چکی تھی اور شاذ ہی انحراف ہوتا تھا''۔ ۴۹؎

مہذب اللغات میں سلاموں کا تذکرہ صرف رثائی اشعار کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور مثالیں بھی اسی قبیل سے دی گئی ہیں۔ ہیئت کے تذکرے کے ذیل میں انھیں غزلوں کا ہم شکل بتایا گیا ہے اور ان میں غزل کے مضامین کی شمولیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جبکہ بیشتر تذکروں میں سلام کے لئے غزل کی ہیئت کے ساتھ ان میں غزل کے مضامین اور آہنگ کی شمولیت کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ نظیر الحسن فوقؔ نے کچھ حدود اور شرائط کے ساتھ سلام کو غزل کا قائم مقام قرار دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عشقیہ اور رندانہ مضامین کے علاوہ جتنے بھی اخلاقی اور تمدنی مضامین غزلوں میں باندھے جاتے ہیں ان سبھی مضامین کی شمولیت کی گنجائش سلاموں میں موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح امداد امام اثرؔ نے لکھا ہے کہ سلاموں میں غزل کے بعض مضامین کے باندھے جانے کی گنجائش کے باوجود سلام کا غزل سرائی سے جدا نظر آنا ضروری ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اثرؔ نے لکھا ہے:

''سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم
واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں۔ مگر ان میں
غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔ سلام کی ترکیب کو
رنگینی کے ساتھ بھی غزل سرائی سے علیحدہ ہونا چاہیئے۔
سلام کا لطف یہی ہے کہ شوخی، رنگینی اور طبیعت داری
کے ساتھ بھی غزل سرائی سے جدا نظر آئے''۔ ۵۰؎

علی جواد زیدی نے اثرؔ کی مندرجہ بالا تعریف میں سلاموں کے تاریخی ارتقا اور مجموعی تصور کی کمی محسوس کی ہے۔ انھوں نے کچھ نکتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سلاموں کی تاریخ پر نظر کیجئے تو ان کے بیانات ہر دور پر
صادق نہ آسکیں گے۔ سلاموں کا ارتقا تدریجی ہوا ہے۔ اثرؔ

جن ''واردات قلبیہ'' اور ''معاملات ذہنیہ'' کا ذکر کرتے ہیں
وہ بہت ابتدائی سلاموں میں نظر نہیں آتے ۔ شروع کے
سلاموں میں بس ایک اعتقادی فضا چھائی ہوئی ہے اور زبان
و بیان تک کی حیثیت ثانوی ہے۔ ممدوح کے لئے عقیدت
اور والہانہ محبت کا اظہار ہی اصل محرک ہے۔ دھیرے
دھیرے اس میں ادبی عناصر کی آمیزش ہوئی۔ معاملات ذہنیہ
یا واردات قلبیہ کا ادبی اظہار اور بعد کی ترقی ہے''۔ [۱۵]

شمالی ہند میں سلام گوئی کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے علی جواد زیدی نے لکھا ہے:

''اردو کے قدیم ترین سلام جو شمالی ہند میں اب تک میری نظر
سے گذرے ہیں وہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد سلطنت سے تعلق رکھتے
ہیں''۔

انھوں نے اس دور کے اہم شعرا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محمد شاہی دور کے مرثیہ گویوں میں نمایاں نام مسکینؔ اور
فضلیؔ کے ہیں۔ مسکینؔ کے بہت سے مرثیے اور کچھ سلام محفوظ
رہ گئے ہیں''۔ نمونہ یہ ہے:۔

اگر سلام کہوں میں تمام قدرت کا
ادائے حق نہیں شاہا تری طبیعت کا
سلام حرف مرکب ہے چار حرف ستیں
میں اس میں کیا کہوں کچھ حق تری حقیقت کا

اے مدینے کے ستارے السّلام — کربلا کے سرا تارے السّلام

یا شاہ جتے تن ہیں تمھیں کرتے ہیں سلام — کیا روح کیا بدن ہیں تمھیں کرتے ہیں سلام

فضلی کی سلام گوئی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بھائی کرم علی کے حوالے سے زیدی صاحب لکھتے ہیں:

"کربل کتھا کے مولف اور مترجم فضل علی فضلی کے بارے میں ان کے بھائی کرم علی نے لکھا ہے کہ ان کو سلام گوئی سے خاص لگاؤ تھا۔"

کیا ہے صرف جو عمر اپنی تجھ محبت میں
مواظبت تھی اسے اے فلک جناب سلام

محمد شاہی دور کے دو اور مرثیہ گو خادم اور جانفشاں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "وہ بھی مسکین اور فضلی کے طرز میں سلام لکھتے تھے" خادم کے سلام کا نمونہ یہ ہے:۔

اے راضی حکم رضا السّلام | اے مقتول تیغ جفا السّلام
امام ذکی، بسمل سرخ پوش | شہنشاہ گلگوں قبا السّلام
کرو اپنے خادم کی خدمت قبول | یہ کہتا ہے نت سرنوا السّلام

مومنا دل سیں کہو دین کے سلطاں پہ سلام | بسمل تیغ ستم، شاہ شہیداں پہ سلام
اولاً بھیج کے خادم تو پیمبر پہ درود | کہو حسین ابن علی شاہ شہیداں پہ سلام

جانفشاں کا نمونہ کلام یہ ہے:۔

اے شہنشاہ دو عالم السّلام | ہے شہید تیغ ظالم، السّلام

علی جواد زیدی نے دہلوی شاعر محمد شاکر ناجی (ولادت تقریباً ۱۷۰۰ء۔۱۶۹۵ء کے درمیان) (وفات تقریباً ۱۷۴۰ء۔۱۷۳۵ء کے درمیان) کی سلام گوئی کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ان کے سلام کے دو شعر نقل کیے ہیں جن کی ردیف "فاتحہ پڑھو" ہے۔ انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان کے کئی سلام مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اسی دور کے ایک نمایاں شاعر شاکر ناجیؔ بھی ہیں۔ان
کے کئی سلام مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔سلام ہی کے مترا
دف معنوں میں وہ لفظ 'فاتحہ' بھی استعمال کرتے ہیں''۔ ۵۲؎

زیدی صاحب نے ناجیؔ کے دیوان میں مرثیہ اور سلام کی معین تعداد کی نشاندہی نہیں کی ہے۔جبکہ دیوان میں کل سات مرثیے ہیں اور سلام کے عنوان سے دیوان میں ایک بھی شعر نہیں ہے۔جن اشعار کو انھوں نے سلام کے عنوان سے درج کیا ہے اس کے سمیت سارے اشعار مرثیہ کے عنوان کے تحت درج ہیں۔اگرچہ ان سب کی ہیئت منفردہ کی ہے۔انھیں مرثیوں میں سے ایک مرثیہ کے شروع کے دو اشعار کو جن کی ردیف ''فاتحہ پڑھو'' ہے کو انھوں نے سلام کے عنوان سے نقل کیا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس دور کے جتنے مرثیے منفردہ کی ہیئت میں ہیں ان سب کو سلام تصور کیا جائے بہ صورت دیگر صرف انھیں اشعار کو سلام تصور کیا جائے جنھیں شاعر نے خود سلام کا عنوان دیا ہو۔

زیدی صاحب کو اس بات کی وضاحت کرنی چاہئے تھی کہ مصنف نے ان اشعار کو مرثیہ کا نام دیا ہے،لیکن چونکہ موجودہ زمانہ کے سلاموں کے بیشتر اوصاف اس مرثیہ میں پائے جاتے ہیں لہٰذا دورِ حاضر کے صنفی اور ہیئتی تقاضوں کے پیشِ نظر انھیں سلام کی صنف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

دہلوی سلام نگاروں میں ایک نمایاں نام مصطفٰے خاں۵۳؎ یکرنگ کا ہے۔ان کی ولادت کی قطعی تاریخ نہیں ملتی۔میر حسنؔ کے قول سے ان کے زمانہ حیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''مصطفٰے قلی خاں یکرنگ در گلشن بہار سخن آب و رنگ و در
چمن گلزار معانی بلبل خوش آہنگ مصطفٰے قلی خاں المتخلص بہ
یکرنگ مرد عمدہ بود در عہد فردوس آرام گاہ بنیرہ خاں جہاں
لودھی در سلک ملازمان بادشاہی منسلک بود۔معاصر میاں آبرو
۵۴؎ خدا لیش بیامرزد۔۵۵؎

محی الدین قادری زورؔ نے لکھا ہے کہ:

''مصطفیٰ قلی خاں خان جہاں لودھی کے نواسے تھے۔ سلسلہ ملازمت شاہی میں وابستہ تھے۔ بعض نے آرزوؔ اور بعض نے آبروؔ کا شاگرد لکھا ہے بعض مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں''۔ ۵۶؎

علی جواد زیدی نے یکرنگ کے تین شعر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یکرنگ کے سلام کے تین شعر سبھی تذکرہ نگاروں نے نقل کیے ہیں''۔ ۵۷؎

زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا گلزار کی نمط ہے بیابان کربلا
کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ دھو ہاتھ زندگی ستی مہمان کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ ہے سر بریدہ شمع شبستان کربلا ۵۸؎

بیشتر تذکرہ نگاروں نے ان تین اشعار کو مرثیہ کے عنوان سے نقل کیا ہے۔ کچھ نے کوئی عنوان نہیں دیا ہے۔ لیکن کسی نے سلام کے عنوان سے درج نہیں کیا ہے۔

اس طرح یہ بات سامنے آئی کہ علی جواد زیدی نے بیشتر قدیم شعرا کے منفردہ مرثیوں کو سلام کے عنوان سے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

سب سے پہلے سلام کی ادبی تنقید کی بنیاد سوداؔ نے رکھی۔ اپنے رسالہ سبیل ہدایت میں انھوں نے اپنے ہم عصر مرثیہ گو محمد تقیؔ گھاسی کے مرثیہ اور سلام پر منظوم تنقید کی ہے۔ رسالہ کی تصنیف کا محرک تقیؔ کے ذریعہ سوداؔ کی مرثیہ گوئی پر کیے جانے والے اعتراضات ہیں۔ سوداؔ نے تقیؔ گھاسی کے اعتراضات اور اپنے جواب کو مثنوی کی ہیئت میں نظم کیا ہے۔

تقیؔ کا اعتراض ہے:

مرثیوں کے سنے جو کتنے بند بندش ان کی نہ آوے اپنے پسند
معنی ان کے تب آویں فہم کے ہاتھ شرح لکھدے جو مرثیے کے ساتھ

مرثیہ وہ جسے عوام الناس | روئیں سن سن پڑھیں جب ان کے پاس
اور سوداؔ کا مرثیہ سن کر | چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دھن کر
کیسی ہی طرح کوئی اس کی بنائے | لیکن اس پر کبھو نہ رونا آئے

سوداؔ کا جواب ملاحظہ ہو:

بارہا یہ سخن ہوا ظاہر | حق میں بندے کے غائب و حاضر
آپ کے مرثیوں کو تب اکثر | ڈھونڈھنے میں لگا ہر اک کے گھر
ہاتھ آیا مرے بسعی تمام | غرض اک مرثیہ اور ایک سلام
سچ ہے یہ مجھ کو مرثیے کا ڈھب | نہیں آتا وہ جس سے رودیں سب
آپ کے مرثیے کا ہوں قائل | خون جس سے عوام کا ہے دل
سن کے جمّا سے جس پہ بدھو تک | شام سے کوٹیں سینہ صبح تلک
لیکن افسوس صد اہزار افسوس | یہی آتا ہے بار بار افسوس
بدھو جمّا سمجھ جسے رودیں | معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہودیں

اس تمہید کے بعد سوداؔ نے تقیؔ کے ایک مرثیہ اور ایک سلام پر منظوم تنقید کی ہے۔ سوداؔ نے تقیؔ کے سلام کے پہلے شعر کی تنقید انتیس (۲۹) اشعار میں کی ہے۔ پہلے شعر پر تنقید کے چند شعر اس طرح ہیں:

سلام کا پہلا شعر:

اے نبیؐ کے باطناً رتبے کے والی السّلام | ظاہراً ان سے بھی ہوا ک نوع عالی السّلام

سوداؔ کی تنقید کے اشعار:

پہلے یہ کہیئے اے کرم فرما | باطنی رتبہ ہے نبیؐ کا کیا

آپ پر جس طرح ہو یہ تحقیق　　اپنے مخلص سے بھی کہو تحقیق
دوسری بات یہ جو کہہ ڈالی　　تم ہو اک نوع ان سے بھی عالی
اور اس نوع کو بیاں کیجئے　　مجھ کو آگاہ اس سے کر دیجے ۶۰

علی جواد زیدی نے مذکورہ تنقید کو سلام کی ادبی اور علمی پرکھ کی سب سے پہلی کوشش قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''سلام کی پہلی بلند آواز تنقید کی ابتدا اسی سلام کے بعد ہوئی۔ اس ابتدا کا سہرا سوداؔ کے سر ہے۔۔۔۔۔ابھی تک جو مواد ہم دست ہے اس کے پیش نظر سلاموں کی ادبی اور علمی پرکھ کی یہ سب سے پہلی کوشش ہے''۔۶۱

دہلوی سلام نگاروں میں ایک اہم نام میر غلام حسین ضاحک کا ہے۔۶۲۔ ضاحکؔ میر انیسؔ کے پردادا تھے۔ علی جواد زیدی کے بقول:

''اُس دور کے شعرا میں سلاموں کا سب سے بڑا مجموعہ انھیں کے کلیات میں ملتا ہے۔ ضاحکؔ نے تقریباً ۳۵ سلام لکھے ہیں''۔۶۳

ضاحکؔ کے بیٹے میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو میں ضاحکؔ کے مرثیہ یا سلام کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔۶۴ ''رباعیات فارسی در مدح امام علیہ السلام'' کے عنوان سے دو رباعیاں نقل کی ہیں۔

ضاحکؔ، میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ کے معاصرین میں تھے۔ ضاحکؔ کے والد میر عزیز اللہ کے دادا میر امامی موسوی ہروی رضوی ایران کے صوبہ خراسان کے دارالسلطنت ہرات سے شاہ جہاں بادشاہ کے دور میں ہندوستان آکر دلّی میں آباد ہوئے تھے۔ میر امامی ایک متبحر عالم تھے۔ کبھی کبھی تفریح طبع کے لئے فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ضاحکؔ

اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ سید محمد عباس آصفؔ نے لکھا ہے:

''ماہ محرم میں امام عالی مقام کی مدح ان کا جز و ایمان تھا۔ اس لئے وہ سلام و مرثیہ وغیرہ نظم کرتے تھے''۔ ۶۵

ضاحکؔ کے دیوان کے دریافت ہونے کی روداد بیان کرتے ہوئے آصفؔ نے لکھا ہے:

''میر ضاحکؔ کا دیوان ۱۹۶۱ء میں بہار کے ایک قدیم ۶۶ کتب خانہ سے جناب قیام الدین قائم نے دریافت کیا ہے۔ ہم ان کے شکریہ کے ساتھ ضاحکؔ کے سلاموں سے منتخب اشعار پیش کر رہے ہیں۔'' ۶۷

سلام السّلام، تم پہ سلام، تم پہ صلوٰت وسلام اور سلام، کی ردیف کے دس سلاموں سے اڑتیس (۳۸) اشعار آصفؔ نے نقل کیے ہیں۔ سبھی سلام غزل کی ہیئت میں ہیں۔ زبان نہایت آسان، سادہ، صاف اور سلیس ہے۔

علی جواد زیدی اپنی کتاب ''انیس کے سلام'' ۶۸ میں ضاحک کے سلام کے چار مصرعوں کو املے کے معمولی فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ آصفؔ کی کتاب میں مذکورہ سلام کے چھ مصرعے ہیں۔ شروع کے دو مصرعے زیدی صاحب کے یہاں کم ہیں۔

امیر علی جونپوری نے ''تذکرہ مرثیہ نگاران اردو'' ۶۹ میں ضاحکؔ کی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن نمونہ کے طور پر انھوں نے سلام کے چار شعر نقل کیے ہیں۔ سلام کے یہ اشعار آصفؔ کی کتاب میں بھی ہیں۔ آصفؔ نے ضاحکؔ کے مرثیے کے اٹھارہ (۱۸) شعر اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ ضاحکؔ کے ایک سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کربلا کے قتیل تم پہ سلام! راہ حق کی دلیل تم پہ سلام!

تشنۂ دشت کربلا تم ہو! ساقی سلسبیل تم پہ سلام!

تین دن تشنہ رہ کے تم نے کیا! خون اپنا سبیل تم پہ سلام!

صبر ایوب تم سے اخذ کیا! یہ ہے صبر جمیل تم پہ سلام!

عرض کرتا ہے یہ غلامؔ حسین ! ہو نہ ہرگز ذلیل تم پہ سلام !

دیگر سلاموں کے مطلع اس طرح ہیں:

اے شہ عالی نسب تم پہ صلوٰت وسلام خسرو والا حسب تم پہ صلوٰت وسلام

تمہارے قبہ اقدس کو یا امام سلام کرے ہے شام وسحر مہر ومہ مدام سلام

یا حسین ابن علیؑ محبوب باری السّلام ختم ہے تجھ ذات پر طاعت گذاری السّلام

اے مصدر فیوض الٰہی سلام لے اے زیب تاج مسند شاہی سلام لے

اے شمس ذوالجلال ہمارا سلام لے اے بدر بے مثال ہمارا سلام لے

امام سوم کا سوم آج ہے جہاں سب اسی غم سے تاراج ہے

سوم ہے اس کا جہاں میں جو ہے امام سوم علیؑ کے عین ہیں اوّل حسنؑ، حسینؑ دوم

علیؑ عالی ولی کے اوپر، درود واجب سلام سنت نبیؐ کے عاشق، وصی کے اوپر درود واجب سلام سنت

سوم ہے اُس کا جو ہو بے وطن مدینے سے بہ دشت ماریہ، مارا پڑا امام امم

ضاحکؔ نے اپنے مرثیے اور سلام میں کہیں ضاحکؔ تخلص کا استعمال نہیں کیا ہے۔ ہر جگہ تخلص کے طور پر اپنا نام غلام حسین ہی نظم کیا ہے۔ اس کا سبب آصفؔ کے اس قول میں تلاش کیا جا سکتا ہے:

''بڑے ہنسوڑ، زندہ دل اور یار باش آدمی تھے اور اپنے مزاج

کی مناسبت سے انھوں نے اپنا تخلص ضاحکؔ رکھا تھا‘‘۔ ۷۰

علی جواد زیدی نے ضاحکؔ کے سلاموں کی ادبی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے ان کے سلاموں میں ادبی شان کی کمی کا بیان ان لفظو میں کیا ہے:

’’اعتقاد اور عقیدت کی فضا قائم اور حفظ مراتب کا خیال رکھنے کے باوجود ضاحکؔ اپنے سلاموں میں ادبی شان پیدا نہیں کر پائے۔ اگر چہ عام مرثیہ نگاروں کے مقابلے وہ قدرت بیان کا مظاہرہ زیادہ کرتے ہیں اور جو کہنا چاہتے ہیں اسے سلاست اور روانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں، لیکن شعریت کے عنصر کی کمی محسوس ہوتی رہتی ہے‘‘ ۷۱

ضاحکؔ کے ہم عصروں میں میرؔ و سوداؔ کے یہاں سلاموں کی ادبی حیثیت زیادہ مستحکم نظر آتی ہے۔علی جواد زیدی نے ان دونوں کی سلام گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’میرؔ و سوداؔ کے ہاتھوں میں پہنچ کر، دوسری اصناف کی طرح اس صنف کی بھی ادبی حیثیت سنورتی ہے‘‘۔۷۲

سوداؔ کی سلام گوئی کا ذکر بہت مختصر طور پر کرنے کے بعد علی جواد زیدی نے معاً بعد سوداؔ کے ہم عصر میر تقی میرؔ کی سلام گوئی کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے:

’’میر تقی میرؔ کا لہجہ بھی بعینہ یہی ہے۔‘‘ ۷۳

اس کے بعد میرؔ کے تین سلاموں کے مطلع نقل کیے ہیں۔

امیر علی جونپوری نے سوداؔ اور میرؔ دونوں کی مرثیہ گوئی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

’’نمونتہً ایک سلام پیش ہے‘‘۔ (تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ص:۲۸۱)

لیکن سوداؔ کے سلسلہ میں جن اشعار کو سلام کے عنوان سے انھوں نے نقل کیا ہے وہ سوداؔ کے کلیات میں مستزاد مرثیہ کے عنوان سے درج ہے۔اگر چہ میر کا سلام نقل کرنے میں ان سے یہ سہو نہیں ہوا۔

سلام کی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوداؔ کے دور میں سلام گوئی کا معیار مرثیہ گوئی کے معیار سے بہتر تھا۔ اس وجہ سے مرثیہ گوئی کے ذکر کے بعد نمونہ کے انتخاب میں محقق کی نظر سلاموں پر ٹھہری اور اس نے اس کے ذکر اور انتخاب کے نقل کرنے کو بہتر اور ضروری سمجھا۔

جیسا کہ بیان ہوا، صنف سلام کی ادبی تنقید کی باضابطہ ابتدا سوداؔ کے دور میں خود انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کے بعد اس صنف میں جدت کے نئے نئے پہلو بتدریج پیدا ہوتے گئے۔ صنف سلام کی تعریف اور اس کے موضوعات کے طرز بیان اور پیرایہ اظہار کے اسلوب کے حدود کی تعیین کو معرض تحریر میں لانے کا آغاز بھی کم وبیش اسی دور سے ہوا۔ جیسا کہ سوداؔ کے رسالہ سبیل ہدایت سے ظاہر ہے۔ اس دور میں سلام کے موضوعات بہت محدود اور رسمی تھے۔ لیکن جدت پسند شعرا کی طبیعت اس پر قناعت کرنے کو راضی نہیں تھی اور اس صنف میں مزید گنجائش پیدا کرنے کے لئے نئے وسائل تلاش کرنے کی تگ و دو مسلسل جاری رہی۔ حامد حسن قادری نے سوداؔ کے دور میں سلام گوئی کے موضوعات کی حدود بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سوداؔ کے زمانے میں سلام صرف اسی نظم کو کہتے تھے جس کی ردیف ''سلام'' ہو اور اہلبیتؑ پر سلام بھیجا جائے۔ یہی وجہ تسمیہ بھی ہے''۔[۴۷]

لیکن سوداؔ کی دلچسپی کی بدولت خود ان کے زمانے میں اور اس کے بعد جو جدتیں اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہ انقلابی تھیں۔ اس جدت اور انقلاب کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض محققین نے اسے غزلوں کا قائم مقام قرار دیا[۴۵] اور بعض نے اسے حزنیہ غزل[۴۶] سے تعبیر کیا۔ کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری ردوبدل اور ترمیم تنسیخ کے ساتھ یہ سلسلہ انیسؔ و دبیرؔ تک قائم رہا۔ لیکن ان دونوں شعرا کے زمانے سے سلام گوئی کے طرز میں تبدیلی کے آثار پوری طرح نمایاں ہو گئے تھے۔ سوداؔ کے دور میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ انھوں نے سلام گوئی کے فن پر

تنقیدی نظر ڈالی اوراپنے سلاموں میں شعری وسائل کا بھرپور استعمال کیا۔لیکن موضوعات کو رثائیت اور مدح اہلبیتؑ تک ہی محدود رکھا۔لیکن انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے میں اس صنف کو نئے معنی پہنائے گئے اوراس میں نئے نئے موضوعات ومضامین کی شمولیت کی راہیں ہموار کی گئیں۔ اسی کے ساتھ اس کے شعری لوازم کی بھی تجدید ہوئی۔

اگر چہ دبیرؔ نے روایتی سلام گوئی کے طریقے کو ہی ترجیح دی۔لیکن انیسؔ و مونسؔ نے تمام قدیمی رسوم وقیود کو یکسر توڑ دیا۔اُس وقت سے سلام کی شناخت کے لئے اس کی ابتدا یا ردیف وقافیہ میں سلام،سلامی اور مجرا، مجرائی کے الفاظ استعمال کرنے کی روایت بھی ترک کردی گئی۔اس طرح بتدریج ارتقا کی منزلیں طے کر کے سلام کی صنف اپنے چنندہ موضوعات کی تنگنائے سے باہر نکل گئی اوراپنے اندر مختلف موضوعات ومضامین کی شمولیت کی گنجائش پیدا کرنے کے ساتھ اپنی دائمی بقا کی راہیں بھی ہموار کرلیں۔

نظیرالحسن فوقؔ نے صنف سلام میں نئے رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''بعض شعرا کے کلام میں سلام کے اشعار ایسے رنگین اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ غزل کا لطف حاصل ہو جا تا ہے۔ میر مونسؔ صاحب کو اس طرز خاص میں شہرت حاصل ہے۔ میر انیسؔ صاحب مرحوم کے سلاموں میں بھی ایسے دلچسپ اور رنگین اشعار پائے جاتے ہیں''۔۷۷

لیکن سوداؔ کے زمانے میں خود سوداؔ کی تمام تر کوششوں کے باوجود سلام اور مرثیہ کی حالت میں خاطر خواہ بہتری نہیں ہوسکی۔ان دونوں اصناف کی بدحالی اوراس کے معیار کا اندازہ آزادؔ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے سوداؔ کے مرثیے اور سلام گوئی کے ذکر میں کیا ہے۔ آب حیات میں اپنے دور کے مراثی سے سوداؔ کے دور کے مرثیوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے سوداؔ

کے سلسلہ میں آزاؔد لکھتے ہیں:

''مرثیے اور سلام بہت کہے ہیں، اس زمانے میں مسدس
کی رسم کم تھی۔ اکثر مرثیے چومصرعے ہیں۔ مگر مرثیہ گوئی کی
آج کی ترقی دیکھ کر ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔
شاید انھیں مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی
تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں''۔۷۸

جب سوداؔ جیسے استاد کی مرثیہ گوئی کے ذکر میں آزاؔد نے اس مثل کا ذکر کیا ہے تو باقی شعرا کی مرثیہ گوئی کا کیا حال رہا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

آزاؔد نے اس دور کی مرثیہ گوئی کی ابتری کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس زمانے کے شعرا کے طرز فکر کو اس زاویہ سے پیش کیا ہے:

''حق یہ ہے کہ مرثیہ کا شاعر گویا ایک مصیبت زدہ ہوتا ہے
کہ اپنا دکھڑا روتا ہے جب کسی کا کوئی مرجاتا ہے تو غم واندوہ
کے عالم میں جو بیچارہ کی زبان سے نکلتا ہے سو کہتا ہے، اس پر
کون بے درد ہے جو اعتراض کرے وہاں صحت و غلطی اور
صنائع وبدائع کو کیا ڈھونڈھنا، یہ لوگ فقط اعتقاد مذہبی مدنظر
رکھ کر مرثیے اور سلام کہتے تھے۔ اس لئے قواعد شعری کی
احتیاط کم کرتے تھے اور کوئی اس پر گرفت بھی نہ کرتا''۔۷۹

جس زمانہ میں شعرا مرثیہ گوئی میں شعری قواعد اور فنی خوبیوں کی احتیاط کم کرتے تھے اسی زمانے میں سوداؔ کی مرثیہ گوئی کی پذیرائی کرتے ہوئے محمد حسین آزاؔد نے لکھا ہے:

''پھر بھی مرزا کی تیغ زبان جب اپنی اصالت دکھاتی ہے تو
دلوں میں چھریاں مار جاتی ہے''۔۸۰

میرؔ و سوداؔ کے ہم عصروں میں ایک اہم نام قائمؔ چاندپوری کا ہے۸۱۔ تقریباً سبھی تذکرہ

نگاروں نے قائم کا ذکر ایک استادفن کی حیثیت سے کیا ہے۔

علی جواد زیدی نے قائم کی سلام گوئی کا ذکر صرف دو جملوں میں کیا ہے۔لیکن اندازہ تحریر سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ انھیں قائم کا ذکر ہے جن کا ذکر تذکرہ نگاروں نے اہمیت کے ساتھ کیا ہے۔زیدی صاحب نے ان کے سلام کے پانچ شعر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''قائم چاندپوری استادفن ہیں۔ان کے یہاں ستھرے
پن کا احساس فطری ہے''۔ ۸۲

اس کے بعد نمونے کے پانچ شعر نقل کیے ہیں:۔

(۱)

اے صبا کہیو مرا ابن پیمبر کو سلام　　داور دنیا و دیں ،شبیر و شبر کو سلام

کوہ عصیاں جس کے سائے میں رکھے ہے حکم کاہ　　اس شفیع روز رستا خیزِ محشر کو سلام

(۲)

خدا سے آئے ہیں جن کی طرف مدام سلام　　کہے ہے واں کے غلاموں کو، یہ غلام سلام

(۳)

قلم نے لوح پہ جس دم نبی کا نام لکھا　　صلٰوۃ ثبت کی ساتھ اس کے اور سلام لکھا

(۴)

نہ مہرباں کے پڑھے بن قبول ہوں قائم　　اگر چہ سلک گہر کے تھے یہ تمام سلام

سلام کے موضوعات کے سلسلے میں سبھی کی نظر رثائیت پر ہے۔کچھ شعرا کے یہاں رثائیت کے ساتھ منقبتی انداز بھی ہے۔قائم کے یہاں دونوں عناصر موجود ہیں۔

علی جواد زیدی نے میر و سودا کی سلام گوئی کا ذکر کرنے کے بعد ایک محمد علی محِب کا ذکر کیا ہے اور ان کے سلام کے نمونے نقل کیے ہیں۔لیکن کسی طرح کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔میر و سودا کی سلام گوئی کی خوبیوں کے ذکر کو محبّ کے ذکر سے مربوط کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان استادوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر سلام قصیدے کی بلند آہنگی اور غزل کے گداز کی آمیزش کے ساتھ ساتھ بے جھول اور صاف ستھرا انداز بیان اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صورت صرف انھیں استادانِ فن کے یہاں نظر نہیں آتی بلکہ دوسروں کے یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً میر محمد علی مُجِبؔ کے یہاں ایسے منقبتی سلام ملتے ہیں''۔ ۸۳؎

جو دیکھوں روضۂ حضرت رسولؐ آنکھوں سے
چڑھاؤں اشک کے قطروں کے پھول آنکھوں سے
ہر اک مجِب کو بلا شبہ حج اکبر ہے
کرے زیارت حضرت حصول آنکھوں سے

مسکین کے ہم عصروں میں ایک ندیمؔ تھے، جن کی شہرت مرثیہ اور سلام گوئی میں تھی۔ ندیم کا نام مرزا علی قلی تھا۔ محمد شاہی دور کے دہلوی مرثیہ گویوں کے ساتھ ندیمؔ کا ذکر کرتے ہوئے امیر علی جونپوری نے لکھا ہے کہ ندیم مرثیہ اور سلام کہنے میں ماہر تھے۔ ۸۴؎

مثنوی سحر البیان کے مصنف میرؔ حسن ۸۵؎ کے یہاں سلام گوئی کے مختصر مگر عمدہ نمونے ہیں۔ جن سے ان کے دور میں سلام گوئی کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے ''اسلاف میر انیس'' میں میر حسن کی سلام گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دوسرے مرثیہ گویوں کی طرح میر حسن نے سلام اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کے دو سلاموں کے چند شعر قدیم بیاضوں سے اور تین رباعیاں غیر مطبوعہ کلیات سے نقل کی

جاتی ہیں'' ۔۸۶

یہ سلام زبان کی سادگی، جذبات کی اثر آفرینی اور غم انگیز اسلوب کا شاہکار ہیں ۔

اے بے دلوں کے دلبر و دلدار السلام   اے بے سروں کے سرور و سردار السلام

بھٹکے ہوؤں کے راہ نما تم ہو یا حسینؑ   غربت زدوں کے مونس و غم خوار السلام

کیا تیرے بعد دکھ میں پڑے سارے اہلبیتؑ   اے بے کسوں کے قافلہ سالار السلام

کیا کہہ سکے حسنؔ ترے اوصاف یا حسینؑ   اے دشت کربلا کے گرفتار السلام

مری جا کے بندگی اے صبا تو ادب سے کہہ اس امام کو

صفیں باندھ باندھ کے جن وانس کھڑے ہیں جس کے سلام کے

وہ امام جس کا وہ پرزے تن رہا خاک وخون میں بے کفن

نہ لحد نہ تختہ نہ گورکن نہ تو وارث ایک ہے نام کو

وہ امام جس کا تھا جد نبیؐ، اماں فاطمہؑ تھی، پدر علیؑ

اسے فرصت اتنی نہ پائے دی کہ وہ پھیر لیتا سلام کو

وہ امام جس کا وہ عابدیں ہوا طوق پیچ وہ دل حزیں

نہ ملا ٹھہرنا اسے کہیں گیا کھینچتا وہ زمام کو

وہ مسافر سفر بلا کہ پیاسا جس کا گلا کٹا

مری کورنش تو کہہ اے صبا اسی تشنہ کام امام کو

کہ وہ دو جہاں کا امام ہے کرم اس کا خلق پہ عام ہے

یہ حسنؔ اسی کا غلام ہے وہ نواز دے گا غلام کو

ان سلاموں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسنؔ کے دور تک آتے آتے سلاموں کے لئے منفردہ کی ہیئت پوری طرح مخصوص ہو چکی تھی اور سلاموں میں رثائیت کے علاوہ موضوعات و مضامین کے باندھے جانے کی راہیں بھی رفتہ رفتہ ہموار ہونے لگی تھیں۔ لیکن محمد عباس آصفؔ نے میر حسنؔ کے سلاموں کے جو نمونے نقل کیے ہیں ان میں مرثیت کا عنصر غالب ہے۔

آصف نے لکھا ہے:

''میر حسنؔ صاحب کے سلام بہت کمیاب ہیں بہت جستجو کے بعد ہمیں چند سلام دستیاب ہوئے ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں''۔ ۸۷

سلامی بین ماں کرتی تھی لے لے نام اکبرؑ کا — نہ چاہا گردش افلاک نے آرام اکبر کا

دلا کر فاتحہ پانی پہ کہتی تھی یہی بانو — کہ یہ کوزہ علی اصغرؑ کا ہے یہ جام اکبرؑ کا

قضا آئی جوانی میں نہ ہونے پائی شادی بھی — قیامت بھر رہا دنیا میں دل ناکام اکبر کا

وطن میں ایک مدت انتظاری میں رہی صغرا — نہ پہنچایا قضا نے اس تلک پیغام اکبر کا

عجب غیرت تھی ماں کی اور پھوپھی کی بے ردائی پر — گیا روتا ہوا نیزے پہ سر تا شام اکبر کا

اذاں کا شور سن کر اہلبیت شاہ والا میں — بپا ہوتا تھا ماتم روز صبح و شام اکبر کا

بھرے تھے سیکڑوں ارمان دل میں آہ اے گردوں — چھدا نوک سناں سے وہ دل ناکام اکبر کا

دم آخر تلک یہ شاہ عالم کا رہا عالم — لیا دل تھام جب آیا زباں پر نام اکبر کا

تڑپ کر شام کے زنداں میں کہتی تھی یہی بانو — پڑا ہے ریگ صحرا پر تن گلفام اکبر کا

نہ رخصت جنگ کی دیتی کبھی میں اپنے اکبر کو — اگر میں جانتی ہووے گا یہ انجام اکبر کا

کہا قاصد نے صغرا سے گیا میں متصل اس دم — شہ دیں روتے تھے، تھام آخری ہنگام اکبر کا

کہا مجھ سے اسی حالت میں کہنا میری خواہر سے — دلانا فاتحہ پانی پہ، ہے پیغام اکبر کا

رہی زندہ جہاں میں جب تلک بانوئے خستہ تن　　فسانہ تھا زباں پر اس کے صبح و شام اکبر کا

حسنؔ منظور ہے گر مغفرت اپنی قیامت میں

تو ہر دم چاہئے رکھنا زباں پر نام اکبر کا

مجرا کہو شبیرؑ پہ اس طرح حزیں ہو　　جو اشک کے سیلاب سے تر ساری زمیں ہو

سر اس کا علَم پر ہو علَم آہ کہ جو شخص　　حیدرؑ کا نشاں دوش محمدؐ کا مکیں ہو

جز حضرت شبیرؑ بھلا کون ہے یارو　　جو ساجد و مسجود دم باز پسیں ہو

صد حیف ملے پیادہ روی اس کے پسر کو　　کونین کی اقلیم کا جو تخت نشیں ہو

خشک احمدؐ مختار کے کس طرح ہوں آنسو　　تر خون میں شبیر کے جب خنجر کیں ہو

سر ننگے نہ کس طرح سے ہوں فاطمہ نالاں　　عریاں پڑی جس دشت میں لاش شہ دیں ہو

اے پیر فلک ہووے جو اکبر جواں آہ　　تیر و تبر ظلم ہو اور اس کی جبیں ہو

ہیہات جو ہو قوت بازوئے حسینی　　شانہ کہیں، سر اس کا کہیں، پاؤں کہیں ہو

محتاج چدر ہوویں وہ اے وائے کہ جن کے　　یوں سلطنت ہر دو جہاں زیر نگیں ہو

ہے حضرت شبیر سے یہ عرض حسنؔ کی

جا مشہد عالی میں یہ پیوند زمیں ہو

میر حسنؔ کے دور تک سلام اپنی شناخت کی تکمیل کا اولین مرحلہ مکمل کر چکا تھا۔ خیالات میں جدت کے ساتھ زبان بھی بہت صاف اور رواں ہو چکی تھی۔ اس دور میں ایسے شعرا پیدا ہوئے جن کی بدولت سلام کی بنیادوں کو مزید استحکام حاصل ہوا۔

میرؔ حسن کے بیٹوں میں ۸۸؎ خلیقؔ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ، خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ خلیقؔ کی تعلیم و تربیت فیض آباد اور لکھنؤ میں ہوئی۔ سولہ برس کی عمر میں غزل گوئی سے شاعری کا آغاز کیا۔ فیض آباد میں خلیقؔ غزل گوئی کے استاد مانے جاتے تھے۔ ۸۹؎

آصفؔ نے خلیقؔ کی سلام گوئی کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

''سلام بھی میر خلیقؔ کے زمانے تک منازل ارتقا میں
تھا۔ ہر سلام کا لفظ ''سلامی'' یا ''مجرئی'' یا ''سلام اس پر'' یا
''اس کو مجرا'' سے شروع کرنا لازمی تھا۔ مصائب اہلبیتؑ کا
حامل ہوتا تھا، اخلاقی یا شاعرانہ یا صوفیانہ مضامین کی
گنجائش نہ تھی۔ مقطع میں شاعر کچھ اپنے متعلق بھی نظم کر دیا کرتا
تھا۔'' ۹۰

مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے خلیقؔ کے آخری عمر کے ایک سلام کے دس شعر نقل کیے ہیں۔ آصف نے اسی سلام کے چار شعر اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں جن میں صرف ایک شعر ایسا ہے جو ادیبؔ کے یہاں نہیں ہے۔

جب تک گڑی نہ لاش سلیمان کربلا
طائر نہ کوئی اڑ کے سوئے آشیاں گیا

ادیب کے نقل کیے ہوئے سلام کے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ ان اشعار کے طرز سے اس وقت کی سلام گوئی کی جہات اور رجحانات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا — دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا
لے کر قد خمیدہ کو اپنے کہاں پھریں — گوشہ ہی پھر ہے خوب جو زور کماں گیا
خالی پڑی ہیں شہر میں کیا کیا عمارتیں — یاں کس مکیں کے ساتھ بتاؤں مکاں گیا
جھک جھک گئیں بہشت میں طوبیٰ کی ڈالیاں — جس وقت رن میں فوج خدا کا نشاں گیا
فضل خدا جو ہو تو نہیں کچھ بہشت دور — دیکھو نصیب حر کہ کہاں سے کہاں گیا
سجاد کہتے تھے کہ پہنچنا محال ہے — واحسرتا کہ دور بہت کارواں گیا
زینب اسیر غم رہیں دنیا میں تا بہ مرگ — نہ زخم دل گئے نہ رسن کا نشاں گیا
اترا جو سر تو حلق شہ دیں نے دی صدا — شکر خدا کہ دوش سے بار گراں گیا

ماتم رہا مزارِ محمدؐ پہ تین دن سادات کا لٹا ہوا جب کارواں گیا
گذری بہارِ عمرِ خلیقؔ اب کہیں گے سب باغِ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا

ان شعار کے علاوہ ادیب نے خلیقؔ کے سلاموں کے اکتیس مطلع نقل کیے ہیں۔ مذکورہ بالا سلام کے تین شعر کے علاوہ ادیب اور آصف نے سلاموں کے جتنے شعر نقل کیے ہیں ان میں تکرار نہیں ہے۔

ادیب نے خلیقؔ کی سلام گوئی کے محاسن اور اس کے مختلف کوائف کا بیان ان لفظوں میں کیا ہے:

''میر خلیقؔ نے سلام بہت کہے۔ ان کے سلاموں کا ایک مجموعہ جو غزلوں کے دیوان کی طرح ردیف وار مرتب کیا گیا، ان کے خاندان میں موجود تھا۔ ۹۱ اس کا بہت سا حصّہ دیمک نے بیکار کر دیا تھا۔ جتنا حصّہ محفوظ تھا وہ نقل کر لیا گیا تھا۔ اس نقل میں اٹھہتّر (۷۸) سلام تھے، کچھ پورے اور کچھ ادھورے۔ ان کے علاوہ ایک سلام کا صرف مطلع اور ایک کا صرف مقطع بھی تھا۔ صفحات کی تعداد بہتّر (۷۲) اور اشعار کی ساڑھے بارہ سو سے کچھ زیادہ تھی۔ صرف چار سلام مربع اور باقی کل سلام غزل کی شکل کے تھے۔ بعض سلاموں میں مسلسل نظم کی شان تھی۔ خلیقؔ کے سلاموں میں واقعات کربلا کے علاوہ کوئی اخلاقی یا اعتقادی یا سوانحی مضمون شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے ۹۲۔ مقطع اس سے مستثنیٰ ہیں''۔ ۹۳

ادیب نے اپنے کتب خانہ کی قلمی بیاضوں اور سید محمد عنایت حسین متین سامانی سہارنپوری کے مرتب کردہ سلاموں کے ایک مجموعہ کے حوالے سے معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے:

''راقم کے ذخیرہ مراثی کی قدیم قلمی بیاضوں میں خلیقؔ کے
بہت سے سلام موجود ہیں۔سید محمد عنایت حسین متین سامانی
سہارنپوری نے بہت سے شاعروں کا ضخیم مجموعہ شمع تعزیت
کے نام سے ۱۲۹۶ھ میں مرتب کیا اور ۱۲۹۷ھ میں مطبع
روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، بریلی میں چھپوا کر شائع کیا۔اس
میں خلیقؔ کے اٹھارہ سلام اور دلگیر کے ایک سلام پر خلیقؔ کا
ایک مخمس بھی شامل ہے۔دلگیر کے سلام کا پہلا مصرع یہ ہے۔
سلامی وصف زلف شاہ خوش خو ہو نہیں سکتا۔'' ۹۴

خلیقؔ کے ہم عصروں میں حیدر بخش حیدری ۹۵ کے یہاں سلام سے صنفی مناسبت اور ہیئتی موزونی رکھنے والے اشعار ملتے ہیں:

درود و فاتحہ پہلے رسول کے اوپر
پھر اس کے بعد علی و بتول کے اوپر
شفیع روز قیامت ہیں احمدؐ و حیدرؑ
نبوت اور ولایت ہے ختم دونوں پر
جناب فاطمہؑ کی کس سے ہو بیاں توقیر
کہ اس کی شان میں نازل ہے آئینہ تطہیر
حسن کی روح کے اوپر سدا درود و سلام
کہ ہے وہ سبط پیمبر امام ابن امام
پلا کے پانی میں سم اس تئیں شہید کیا
کلیجہ اس شہ بیکس کا ٹکڑے ہو کے گرا
حسینؑ کشتۂ خنجر پہ جان و دل سے سدا
درود و فاتحہ بھیجوا ے نے بندگان خدا

تمہارے واسطے سر اس نے اپنا کٹوایا
تمہارے واسطے گھر اس نے اپنا لٹوایا ۹۶

اگر چہ اس سے پہلے باضابطہ سلام کہے جانے کی طویل روایت موجود ہے لیکن حیدریؔ کے اس عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ سلام کی اصطلاح اور اس کے لئے منفردہ کی ہیئت پوری طرح مخصوص نہیں ہوتی تھی۔ اس انداز کے اشعار کی ہیئت اور عنوان کے لئے شعرا کو آزادی حاصل تھی۔ جس کی مثالیں متعدد شعرا کے یہاں مل جاتی ہیں۔

انیسؔ، دبیرؔ اور مونسؔ سے پہلے سلام کی صنف کے لئے ہیئت اور عنوان کی شرط اور پابندیاں ایسی نہیں تھی جس سے انحراف نہ کیا جا سکے۔ اس کے باوجود منفردہ کی ہیئت کو ہی پسندیدہ ہیئت تصور کیا جاتا تھا اور اسی کو غلبہ حاصل تھا۔ مصحفیؔ ۹۷، جراَتؔ ۹۸ اور رنگینؔ ۹۹ کے سلام بھی منفردہ کی ہیئت میں سلام کے عنوان سے ہی ہیں۔ ہم عصروں کے مقابلہ مصحفیؔ کے یہاں ادبیت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے سلام کے ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سلام کی ادبی خوبیوں کی طرف ارادی توجہ کی جانے لگی تھی۔

سلامی دیکھ امام زماں کے تن کی طرف — پھر اس کے بعد لہو ڈوبے پیرہن کی طرف
لگے تھے زخم زبس پیکر مقدس پر — نگاہ جاتے ہوئے ڈرتی تھی بدن کی طرف
یہ چاہئے کہ کھڑے ہو کے مرثیہ وہ سنے — جو گذرے تعزیہ داروں کی انجمن کی طرف
ہے مصحفیؔ کے کلام فصیح میں یہ سلام — ذرا زباں کی طرف دیکھ اور سخن کی طرف

سلامی اشک سے یہ چشم مومنین تر ہے — کہ جس سے فرش ہے نمناک اور زمیں تر ہے
یہ پُر ہوئے ہیں شہیدوں کے خون سے تھالے — کہ قتل گاہ کی دو دو وَجَبْ زمیں تر ہے
لکھوں میں حال شہیدوں کا مصحفیؔ کب تک — کہ دیدۂ قلم معجز آفریں تر ہے

جرأتؔ کا سلام بھی مصحفیؔ کی طرح عقیدت سے پُر ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ زبان کی قدامت کا رنگ بھی ظاہر ہے۔

سلام اس پہ کہ جس نے قدم جدھر رکھا　　تو آسماں نے بھی اودھر زمیں پہ سر رکھا
سلام اس پہ کہ جس نے رہ مصیبت میں　　رضائے حق میں قدم اپنا بے خطر رکھا
اُسی سے نور بصر تو طلب کرائے جرأتؔ　　نشان جس نے مٹا اپنا ، نام کر رکھا

رنگینؔ کے سلام کا لہجہ قصیدے کے زیادہ قریب ہے:

مدام جھک کے یہ کرتا فلک ہے جس کو سلام
وہی امام ہے کیسا ، امام ابن امام

بہادر شاہ ظفرؔ کے عہد میں دلی اور لکھنؤ دونوں مقامات صنف سلام کی مقبولیت کے اعتبار سے ترقی کی منازل طے کر چکے تھے۔علی جواد زیدی نے اس زمانے کی سلام گوئی کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''بہادر شاہ ظفر کے دور میں سلام ایک مقبول صنف سخن بن چکا تھا۔ظہیرؔ، ظفرؔ، غالبؔ، سالکؔ، افسوسؔ، عارفؔ، مولوی محمد باقرؔ شہید باقرؔ کی طرح کئی شعرا کے سلام موجود ہیں۔ اس دہلوی سلسلے کی کڑیاں داغؔ تک ملتی چلی جاتی ہیں۔ بلکہ دور حاضر تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ادھر لکھنؤ میں احسانؔ و گداؔ ضمیرؔ و خلیقؔ، فصیحؔ و دلگیرؔ نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور یہ انیسؔ و دبیرؔ و مونسؔ کے ہاتھوں پروان چڑھی''۔[۱۰۰]

غزلوں کی طرح غالبؔ کا سلام بھی امتیازی ادبی شناخت کا حامل ہے۔ یہ سلام مخصوص مدحیہ اور منقبتی لوازم کے ساتھ رثائی عناصر کی شمولیت کے طرز کے اعتبار سے بھی منفرد ہے۔
غزل گو شعرا کی سلام گوئی کے رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے اسد اریب نے کچھ نکتوں کی

جانب اس طرح اشارہ کیا ہے:

''غزل گو شعرا باوجود سعی مخلصانہ کے مرثیہ نہ کہہ سکے، لیکن سلام انھوں نے بہتر سے بہتر کہے۔ بلکہ ان کی غزل کی تمام تر عظمت ان کے سلاموں میں بھی پورے طور پر اتر آئی ہے۔ میرؔ و سوداؔ جیسے با کمال استادوں نے مرثیے سے زیادہ اچھے سلام کہے ہیں۔ غالبؔ نے اقرار کیا ہے کہ میں مرثیہ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن غالبؔ نے جب بھی سلام کہا ہے ۱۰۱۔ اس میں ان کی غزل کا پورا زور دکھائی دیتا ہے۔'' ۱۰۲

غالبؔ کا سلام بیس (۲۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ مکمل سلام مقالہ کے تیسرے باب میں درج ہے۔

اسد اریب نے غزل اور سلام کے درمیان، دونوں کے موضوعات میں کچھ مشترک قدروں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے حد فاصل کو ان لفظوں میں واضع کیا ہے:

''غزل اور سلام کو موضوع کے اعتبار سے اگر علیحدہ کیا جا سکتا ہے تو محض اس اعتبار سے کہ سلام کا موضوع وہی ہے جو مرثیے کا ہے۔ یعنی مرثیے کے موضوع کو غزل کی شکل میں ڈھالنے کا نام ''سلام'' ہے''۔

(اردو مرثیے کی سرگذشت۔ ص: ۱۶۳)

علی جواد زیدی نے دہلوی اور لکھنوی سلام گوئی کے مجموعی رجحان اور پس منظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دلّی میں بہادر شاہ ظفرؔ کا دور اور لکھنؤ میں ضمیرؔ و خلیقؔ کا دور لٹتی ہوئی سرکاروں کا دور تھا۔ اس دور میں منقبتی اور رثائی ادب اپنے عروج کو پہنچا اور صاحب اعتقاد شاعروں کا ایک

پورا گروہ ابھر آیا۔...................اٹھارہویں صدی کے
آخر اور انیسویں صدی کے شروع سے سلاموں پر توجہ کی جانے
لگی تھی۔ظفرؔ کے زمانے تک یہ رو کافی پھیل گئی تھی۔''(انیسؔ
کے سلام۔ص:۳۰)

غالبؔ تنہا نہیں بلکہ ظہیرؔ دہلوی اور بعض اور سلام گویوں کے
یہاں بھی ادب کے گہرے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں
.................پیرایہ اظہار کی ندرتیں، بندشوں کی چستی اور
زبان کے چٹخارے بھی ملنے لگتے ہیں۔گویا اب سلام نمو کی
ابتدائی منزلیں طے کر چکا ہے...........اب شاعر غالبؔ کی
طرح پیغامِ حسینی کی آفاقیت کے بارے میں سوچنے لگا ہے''۔
(انیسؔ کے سلام،ص:۳۱)

ابتدا میں سلاموں کو مرثیوں کا قائم مقام تصور کیا جاتا تھا۔اس وجہ سے رثائیت کا عنصر سلاموں پر غالب نظر آتا تھا۔لیکن رفتہ رفتہ رثائیت کا یہ رنگ ہلکا ہوتا گیا اور اس کی جگہ تغزل اور زندگی کے دوسرے مسائل و موضوعات نے لینی شروع کر دی۔کسی موقع پر مدح و منقبت کے پیرائے میں رثائی گوشے پیدا کیے گئے اور کہیں سلام کے پیرایہ میں واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کو باندھے جانے کی راہ ہموار کی گئی۔

سلاموں کے بدلتے ہوئے رجحانات اور مضامین و موضوعات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علی جواد زیدی نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''ان سلاموں کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ منقبت کی
چھاپ کچھ اور گہری ہوتی جا رہی تھی اور رثائی رنگ ہلکا پڑتا
جا رہا تھا۔ظہیرؔ دہلوی کے اشعار سلام کے نمونے سے یہ بات
زیادہ واضح ہو جائے گی''۔ (انیس کے سلام،ص:۳۲)

سلامی لڑ گئی تقدیر شہ پر رونے والوں کی　　یہ آنکھیں جنت الماوی کی ہیں مہریں قبالوں کی

عجب پیچیدگی میں فکر ہے نازک خیالوں کی　　ثنا ہے کن گل اندا موں کے گھونگھر والے بالوں کی

علیؑ کی تیغ سے فوج عدو کے چہرے کٹتے تھے　　قضا بیٹھی ہوئی تھی گھات میں شامی رسالوں کی

ظہیر مدح خواں جو جو ثنا خوان محمدؐ ہیں　　زبانیں شکرافشاں ہیں انھیں شیریں مقالوں کی

ترقی یافتہ دور میں معیاری سلام کی مثالیں صرف مرثیہ گویوں تک ہی محدود نہیں رہیں، اس صنف نے خالص غزل گو شعرا اور شاہان وقت کو بھی اپنا گرویدہ اور حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ دلّی میں بہادر شاہ ظفر اور لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر کے یہاں سلاموں کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

ظفر کے سلام کی مثال ملاحظہ ہو:

دیں نہ، اے مجرئی اس شہ کو ستمگر پانی
جس کی ہو تشنہ لبی دیکھ کے پتھر پانی

باندھی کمر ہے شہ نے شہادت کے واسطے　　اے مجرئی شفاعت امت کے واسطے

سر کاٹا اس جناب ہدایت مآب کا　　بلوا کے گمرہوں نے ہدایت کے واسطے

کھانا اگر ہے زخم تو پانی ہے آب تیغ　　مہمان کربلا کی ضیافت کے واسطے

ان مثالوں سے قطع نظر اس دور کے بیشتر دہلوی سلاموں پر رثائیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ مولوی محمد باقر شہید باقر دہلوی کا سلام منقبتی اور رثائی سلام کی بہترین مثال ہے:

اے سلامی! صبر سبط مصطفیٰ پر ختم ہے　　ظلم و کیں، مجرائی، شمر بے حیا پر ختم ہے

کیوں نہ ہو کحل البصر خاک شفا کونین کو　　روشنی چشم بھی اس طوطیا پر ختم ہے

دے کے سر نانا کی امت کو چھڑایا نار سے　　رحم اسے کہیے کہ اس نورِ خدا پر ختم ہے

سرسناں پر بھی سنا قرآن ہی پڑھتا رہا　　یا دحق با اللہ ، شہ معجز نما پر ختم ہے

سرسناں پر، پرسرِ مو بھی نہ قبلہ سے پھرا　　قبلہ رو رہنا شہ قبلہ نما پر ختم ہے

جانِ ختم المرسلیں کے پاؤں پر سر دم اخیر　　خا تمہ با لخیر حُر با وفا پر ختم ہے

زیرِ خنجر دیکھ شہ کو بولے سب جن و ملک　　صبر و تسلیم و رضا آلِ عبا پر ختم ہے

جان کیا مخلوق ارضی کی جو جانے ان کا فضل　　ان کا علم و فضل خلاّق سما پر ختم ہے

کیا لکھے باؔقر اب آگے وصف آل مصطفیٰؐ

وصف ان کا خاص ذات کبریا پر ختم ہے

تاریخی اعتبار سے دہلوی سلام نگاروں کو لکھنوی سلام نگاروں پر اولیت حاصل ہے۔ لیکن لکھنوی سلام نگاروں نے اس صنف کو فن کی انتہائی بلندیوں پر اس طرح پہنچایا کہ وہ دہلی کی اولیت پر سبقت لے گئے۔ ابتدا میں لکھنوی سلام گویوں کے یہاں بھی دکنی اور دہلوی طرز غالب تھا۔ اسی غلبہ کے زیر اثر ان کے یہاں رثائی رنگ کی سلام گوئی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ مرثیہ کی ذیلی صنف ہونے کے تصور کے سبب سلاموں کے لئے رثائی لہجہ ہی زیادہ معتبر سمجھا جاتا تھا۔ بقول علی جواد زیدی:

''ضمیؔر و دلگیؔر ہی نہیں بلکہ دبیؔر تک اسی روایتی لہجہ کو اپنائے ہوئے تھے۔'' (انیس کے سلام۔ص:۳۴)

ضمیؔر و خلیقؔ کے سلام مدح و رثا تک محدود ہیں۔ ان کے سلاموں میں وہ ترقی یافتہ آہنگ نہیں جو فصیحؔ و دلگیؔر کے بعد انیسؔ و مونسؔ کا امتیاز ہے۔

ضمیؔر کے سلاموں سے مثالیں ملاحظہ کریں:

مجرئی! شہ نے کہا میں جو نہ بے سر ہوتا　　حشر کو تاجِ شفاعت نہ میسر ہوتا

شاہ کہتے تھے اگر تیر نہ لگتا آکر دیکھتے تم کہ جواں کیا علی اصغر ہوتا

شاہ کہتے تھے یہ ہے ذوق شہادت اے شمر! ہم تجھے دیتے جو تجھ پاس نہ خنجر ہوتا

ہوتیں خاتون قیامت تو قیامت ہوتی حشر ہو جاتا اگر شافع محشر ہوتا

مجرائی تا بہ مرگ خدا مہرباں رہا ثابت قدم حسینؑ دم امتحاں رہا

تکبیر سے عیاں یہ ہوا مرتے مرتے تک اکبر کا نام شاہ کے ورد زباں رہا

سلاموں میں ضمیرؔ کا انداز پوری طرح روایتی ہے۔جس طرح کی جدت آفرینی کی بنیاد انھوں نے مرثیوں میں ڈالی، سلام اس طرح کے جدید انداز اور آہنگ سے خالی ہیں۔

فصیحؔ اپنے عہد کے زبردست مرثیہ گو تھے۔ان کی سلام گوئی کا انداز اور لہجہ سب سے نرالا اور منفرد ہے۔ان کے سلاموں میں عجیب طرح کا کیف اور نغمگی ہے۔ان کے سلاموں میں ترنم اور طرفگی کا یہ عالم ہے کہ جیسے انھوں نے انتہائی سرور اور وجد کے عالم میں سلام کے اشعار قلم بند کیے ہوں۔دو سلاموں کے مطلع اور ایک سلام کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے

سر اپنا کعبہ کے سنگ در پر سیاہ پردہ ٹپک رہا ہے



وہ سلام کہیے حسینؑ پر کہ بہشت جس کا صلہ ملے

یہ طلب تو اپنی طرف سے ہے پہ وہاں سے دیکھئے کیا ملے

شادؔ عظیم آبادی نے فصیحؔ کے ایک سلام کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ایک سلام میر ضمیرؔ کے بارے میں مشہور ہے مگر درحقیقت میرزا فصیحؔ کا ہے۔

سلام اس پہ جسے حق نے کامیاب کیا
جہاں میں شاہ شہیداں عطا خطاب کیا
گرا زمین پہ جس وقت خلد کا سفری
ملک پکارے کہ سرور نے پا تراب کیا''۔ (فکر بلیغ۔ص:۹۵)

میر ضمیرؔ نے فصیحؔ کے اسی سلام کا خمسہ کہا ہے، جس کے مندرجہ ذیل مصرعے شادؔ نے فکر بلیغ میں نقل کیے ہیں:

الٰہی روز ازل سے یہ آرزو ہے مجھے — کہ تو نجف کی زیارت مجھے نصیب کرے
ضمیرؔ اپنے عقائد وہاں پہ تجھ سے کہے — فصیحؔ خالق عالم نے علم کا اپنے
نبیؐ کو شہر کیا اور علیؑ کو باب کیا

ایک اور سلام جس کا آہنگ فصیحؔ کے دیگر سلاموں سے مختلف ہے اور رثائی تاثیر کے اعتبار سے بھرپور ہے۔

کفن پہنے شہ مظلوم کے انصار رن میں تھے
سلامی چاند سے چہرے وہ تابندہ کفن میں تھے

ایک مشہور سلام کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

جو کہے سلام بصد ادب شہ تشنہ لب کی جناب میں
وہ بروز حشر عجب نہیں کہ رواں ہو شہ کی رکاب میں
جو شمیم زلف حسین ہے جو عرق میں شہ کی ہے بوئے خوش
نہ یہ بو ہے عنبر و مشک میں نہ یہ بو ہے عطر و گلاب میں
وہ خیام شہ کے جلا دیئے وہ قناتیں پھونک دیں آگ سے
سر حور خلد کی چوٹیاں ہوئیں صرف جن کی طناب میں

عجب اہل شام تھے بے حیا جنھیں پاس شرم ذرا نہ تھا
سر پاک سبط رسول کو گئے لے کے بزم شراب میں

جو کیا سوال امام نے کہ نماز ظہر کا وقت ہے
مجھے سجدہ کرنے دو فرض ہے تو کہا لعیں نے جواب میں

نہ ملے گی فرصت دم زدن نہ پڑھ اے حسینؑ نماز تو
کہ نہیں قبول ہے بندگی تری آج حق کی جناب میں

جو نہال تازہ ہو باغ میں اسے کاٹتے نہیں باغباں
یہ غضب ہے اکبر نوجواں ہوئے قتل عین شباب میں

شب قتل چونک کے خواب سے یہ پکاری زینب دلحزیں
مجھے اے حسین برہنہ سر نظر آئیں فاطمہ خواب میں

کبھی سر کے بالوں سے فاطمہ یہ زمین جھاڑ کے کہتی تھی
نہ رہے خلش خس و خار کی مرے گل کے بستر خواب میں

کبھی پانی لا کے چھڑکتی تھی یہ سخن تھا لب پہ کہ سو دے گا
کل ابوتراب کا دل ربا اسی بن کی گرم تراب میں

جو سنو کلام فصیح کا تو درود بھیجو رسولؐ پر
یہ صلا جو دو گے سلام کا تو شریک ہو گے ثواب میں

ترقی یافتہ دور کے سلاموں میں ہیئت اور موضوعات دونوں کے اعتبار سے جو ٹھہراؤ نظر آتا ہے اس کی ابتدا کے نقوش دلگیر کے سلاموں سے ملنے لگتے ہیں۔ مرثیوں کی بہ نسبت ان کے سلاموں کی شہرت اور پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ دلگیر کے یہاں رثائی اور مبکی عناصر و موضوعات کے ساتھ وہ اثرات بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ نمایاں ہیں جو آگے چل کر انیسؔ و مونسؔ کے سلاموں کا مجموعی امتیازی وصف تصور کیے جاتے ہیں۔ دلگیر کے سلاموں کے انھیں پہلوؤں کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے شاؔد عظیم آبادی نے لکھا ہے:

''سلام میں مُبکی شعروں کے علاوہ غزل کے طور پر کوئی
مدحیہ شعر کہہ دینا کیا عجب ہے کہ دلگیرؔ ہی کی ایجاد ہو۔ مثلاً ان
کے سلام کا یہ مطلع ہے۔

سلامی وصف زلف شاہ خوش خو ہو نہیں سکتا
رہِ باریک ہے دخل اک سر مو ہو نہیں سکتا ''۔ ۱۰۲؎ (فکر بلیغ۔ص:۳۵)

دلگیرؔ کے رثائی اور روایتی طرز کے سلام کے نمونے ملاحظہ ہوں:

اے سلامی وطن شاہ تو کچھ دور نہ تھا — لیک شبیر کو پھر جانا ہی منظور نہ تھا
سر کھلے بلوے میں لے جائیں کسی کے ناموس — پیش ازیں ملک عرب میں کبھی دستور نہ تھا
اور خاصان خدا پر بھی قیامت گذری — پر سوا شہ کے کوئی درد میں مسرور نہ تھا

چادریں چھینیں جب ان چاک گریبانوں کی — مجرائی شاہ کی بہنوں کو پڑی جانوں کی
آل احمد کو بُلا گھر سے پیاسا کیا ذبح — کیا ضیافت کی ستم پیشوں نے مہمانوں کی
بیبیاں راہ میں کہتی تھیں کہ پانی مانگیں — کوئی بستی جو نظر آئے مسلمانوں کی

جن ستم گاروں نے شہ پر کیا ظلم اے دلگیرؔ
کیسی خلقت تھی میں حیراں ہوں ان انسانوں کی

ہے سلام اس پر تلف جس کی جوانی ہوگئی — جس کی شادی اہل دنیا کو کہانی ہوگئی
مر گیا پیاسا جو شمع دودمان ۱۰۳؎ مصطفٰے — شمع اس غیرت سے گھل کر پانی پانی ہوگئی

دلگیرؔ کے سلاموں کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے شاؔد عظیم آبادی نے لکھا ہے:

> ''دلگیرؔ کے کلام کی پوری تعداد تو معلوم نہیں مگر ایک صاحب نے جناب میرزا دبیرؔ کی صحبت میں راقم سے بیان کیا کہ ان کے سات سو سلاموں تک تو میں نے گنے ہیں''۔
>
> ....اس صحبت میں ایک دوسرے صاحب لکھنؤ کے بیٹھے تھے۔ میرزا دبیرؔ مرحوم نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اجی شیخ صاحب تمہارا گھر تو دلگیرؔ مرحوم کے گھر سے ملا ہوا تھا۔ تم تو کچھ کہو۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا جناب میں نے خود اپنی آنکھوں سے کئی کئی بڑے بڑے صندوق مرثیوں اور سلاموں سے بھرے دیکھے ہیں'' ۱۰۴

دلگیرؔ کی زبان اور طرز بیان کے بارے میں ضمیرؔ اور خلیقؔ سے ان کی زبان کا موازنہ کرتے ہوئے شادؔ نے یہ رائے قائم کی ہے:

> '' بہ نسبت میر ضمیرؔ کے ان کی زبان زیادہ اور بہ نسبت میر خلیقؔ کے کم فصیح و سلیس ہے ۔.............دلگیر ....روائتیں نظم کر کے ان میں اکثر مُبکی گوشے پیدا کر دیتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ مجلس میں بہ نسبت واہ واہ کے آہ آہ زیادہ ہو''۔ ۱۰۵

اس کے بعد ترقی یافتہ زمانے کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو آج تک معیار و میزان بنا ہوا ہے۔ اس دور کی تفصیل آئندہ ابواب میں آئے گی۔

سلام گوئی کا فن :۔

اردو کی پیدائش اور اس کی تشکیل اس زمانے میں ہوئی جب سارا ملک ایک زبردست لسانی تبدیلی کے دور سے گذر رہا تھا۔ ہر جگہ مقامی زبان اور بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی زبان کے الفاظ تیزی سے داخل ہو رہے تھے۔ اسی کے ساتھ شعر گوئی اور شعر خوانی کا بھی آغاز ہوا اور مختلف صنفیں وجود میں آئیں۔

آغاز کے ساتھ ہی شاعری مذہبی اور غیر مذہبی کے خانوں میں تقسیم ہوگئی۔ مذہبی شاعری میں حمد، نعت، مرثیہ، منقبت اور قصیدے تھے۔ اور غیر مذہبی شاعری میں غزل کو امتیاز حاصل رہا۔ رفتہ رفتہ غزل کی صنف نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ بقول اسد اریب ''شرف شعر کا تعین غزل کے سانچے سے کیا جاتا تھا''۔[۱۰۶]

غزلوں میں احساسات کے اظہار کی آزادی زیادہ حاصل ہوئی۔ وہ مضامین اور واقعات جن کی سمائی اور اظہار کی گنجائش غزلوں میں براہ راست ممکن نہیں تھی، انھیں تلمیحات اور استعاروں کے وسیلے سے مہذب پیرائے میں بیان کرنے کی راہ سلاموں کے ذریعہ نکالی گئی۔

بقول محمد زماں آزردہ:

> ''سلام چونکہ غزل سے مماثلت رکھتا ہے اس میں مختلف مضامین ادا ہوتے ہیں۔ ایک شعر کا تعلق دوسرے سے ہونا ضروری نہیں۔ صرف ایک پابندی اس میں ہے کہ معیار اخلاق سے گرے ہوئے جذبات کو غلط انداز میں برانگیختہ کرنے والے اور مبتذل مضامین نہیں لائے جاسکتے''۔[۱۰۷]

سلام کے فن پر گفتگو کرنے سے پہلے غزل کی ابتدا اور اس کے وجود میں آنے کے واقعہ پر ایک سرسری نظر ڈالنا مفید ہوگا، جس سے اندازہ ہوسکے کہ غزل جیسی مایہ ناز اور معتبر صنف کی ابتدا

کس طرح دوسری اصناف شاعری کی مرہون منت ہے۔اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے فضل امام نے لکھا ہے:

''قبل اس کے کہ غزل اور سلام کے رابطے سے بات آگے بڑھائی جائے یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ خود غزل کی اپنی کوئی مخصوص روایت بھی ابتدا میں موجود نہ تھی۔ قصیدے کی نسیب کی شکل میں ابھرنے والی صنف ''غزل'' قرار دے دی گئی۔اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قصیدے اور مرثیے کی روایت کے بین بین ایک اسلوب ظہور پذیر ہوا جو بعد کو غزل کہلایا''۔ ۱۰۸

فضل امام نے غزل میں شامل مضامین میں توازن پر خاص زور دیا ہے۔ان کے خیال میں توازن کا قیام ہی غزل کو غزل بناتا ہے، ورنہ وہ قصیدہ یا مرثیہ بن جائے گی یا ہیئت کے مطالبے کے پیش نظر سلام قرار پائے گی۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اس میں ذرا سا بھی توازن واعتدال بگڑنے پر یہ اپنی کیفیت کھو بیٹھتی ہے۔یعنی اگر نشاطیہ جز حاوی ہو گیا تو غزل قصیدہ بن جاتی ہے اور رنج وغم ،الم و درد کے مضامین کی افراط ہو جانے پر مرثیہ ہو جاتی ہے۔لیکن سلام کے متعلق غزل کی وہ توصیف زیادہ موزوں ہے جس میں دردانگیزی اور آہ و فغاں کا تاثر پایا جاتا ہے''۔ ۱۰۹

سلام کی ایجاد اور بہ حیثیت فن اس کی ترقی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

''تمام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا ،لیکن غزل کی لے اس قدر کانوں

میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اس بنا پر انھوں نے غزل کے طرز پر سلام ایجاد کیا''۔ ۱۱۰

آخری جملہ میں لفظ ''طرز'' وسیع مفہوم کا احاطہ کرتا ہے اس میں ہیئت اور موضوعات دونوں شامل تصور کیے جائیں گے۔ سلام کے غزل کے طرز پر ایجاد کیے جانے کے خیال کے باوجود غزل کے رنگین اور عاشقانہ مضامین سلاموں کا لازمی جز نہیں بن سکے۔ نہ ہی سلاموں میں رثائی موضوعات کی شمولیت پر کوئی پابندی لگائی گئی۔ اس آزادی اور رعایت کا فائدہ اپنی اپنی پسند و پس منظر کے لحاظ سے سبھی سلام نگاروں نے اٹھایا۔ اس طرح سلام بتدریج ایک معیاری فن کی شکل اختیار کرتا گیا۔ سلام اور غزل کے درمیان کے فرق کو بیان کرتے ہوئے اسد اریب نے لکھا ہے:

''غزل کی ساری تعریف اس پر ذرا سے تغیر کے ساتھ پوری اترتی ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک الگ مفہوم رکھتا ہے اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اپنے ماقبل و مابعد سے منسلک ہو۔ اسی طرح سلام کے اشعار ہیں کہ وہ مفہوم کے اعتبار سے الگ تھلگ بھی رہ سکتے ہیں''۔ ۱۱۱

شیخ چاند نے سلام کے غزل کے طرز پر ایجاد کیے جانے کے خیالات سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے مولانا شبلی نعمانی اور مولوی سلیم کی آرا کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''ہمیں ان بزرگوں کی رائے سے اتفاق نہیں۔ صنف سلام جب وجود میں آئی تو صرف غزل کی شکل تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ مرثیے کی طرح اس کو وسعت دی گئی۔ چنانچہ خود سوداؔ کے سلام غزل نما شکل کے علاوہ مربع صورت میں بھی موجود ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہ غزل گوئی کے چرچے سے متاثر ہو کر

مرثیہ گویوں نے سلام کو غزل کے طرز اور جواب میں ایجاد
کیا، کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا''۔۱۱۲

شیخ چاند نے سودؔا کی سلام گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس زمانے کی سلام گوئی کے موضوعات کو موجودہ دور کے سلاموں کے موضوعات ومضامین سے اس طرح ممیّز کیا ہے:

''سلام کے جو لوازم اور مہمات موضوع حال کے سلام گو شعرا نے مقرر کر لیے ہیں ان کی سودؔا کے زمانے میں تحدید و تعیین نہیں ہوتی تھی۔ان کے زمانے میں سلام کہنے کا مدعا صرف یہ تھا کہ شہیدان کربلا اور خصوصاً امام حسینؑ کی جناب میں عقیدتمندانہ سلام و نیاز کا تحفہ بھیجا جائے ،جیسا کہ اس زمانے کے شاعروں کے اور خصوصاً سودؔا کے مشہور ہم عصر 'میرؔ' نے بھی سلام لکھا ہے،اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔رسالۂ سبیل ہدایت میں تقی کا جو سلام درج ہے اس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔میرؔ کا ایک مربع سلام رسالۂ اردو بابت جنوری ۱۹۳۱ء میں چھپ چکا ہے۔ہم ایک بند نقل کرتے ہیں:۔

درویش بے بضاعت ہے میرؔ دست کوتہ
غیر از سلام تحفہ رکھتا نہیں ہے کچھ وہ
ہر لحظہ اور ہر دم ، ہر گاہ اور بے گہہ
اے شاہ دوسرا کے تجھ کو سلام پہنچے''۔۱۱۳

شیخ چاند لکھتے ہیں کہ ان شواہد کی موجودگی میں یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ غزل کے طرز اور جواب میں سلام کی ایجاد ہوئی۔اگر چہ وہ اس سلسلہ میں کچھ نکات کو تسلیم کرتے

ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں:

''یہ ممکن ہے کہ لکھنؤ کے بعد کے مرثیہ گویوں نے خاص
موضوعات اور خاص لوازم مقرر کر لیے ہوں، لیکن سوداؔ کے
زمانے میں یہ التزام نہیں تھا۔ سلام کا صرف ایک ہی مقصد تھا
اور وہ پرخلوص اور مودّبانہ تسلیم و نیاز''۔۱۱۴

غزل کی مقبولیت اور اہمیت کے تعلق سے اب تک فرض کیے گئے مسلمات کے برعکس شیخ چاند نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ''اُس زمانے کے مرثیہ گو غزل کو حقیر جانتے تھے''۔۱۱۵ ثبوت کے طور پر انھوں نے سوداؔ کے ہم عصر مشہور مرثیہ گو شاعر تقی گھاسی کے مرثیہ کے یہ شعر نقل کیے ہیں:

میں اس کو جو اک طول دے کر ہے لکھا
غزل نہیں ہے، ہے مرثیہ نام اس کا
ذرا منصفوں سے ہے اب اس کا دعوا
بیان شہادت کا اک یہ بھی ڈھب ہے ۱۱۶

شیخ چاند نے انھیں مثالوں کو دلیل بناتے ہوئے آگے لکھا ہے:

''ان حالات میں غزل کی تقلید اور ریس کرنا اور اس
کے جواب میں سلام کو لا کھڑا کرنا مرثیہ گو ہرگز پسند اور گوارا
نہیں کر سکتے تھے''۔۱۱۷

شیخ چاند کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مجالس عزا میں مرثیہ خوانی سے پہلے سلام پڑھے جانے کا رواج پرانا ہے۔ انھوں نے سوداؔ کے زمانے میں منعقد کی جانے والی مجالس عزا میں سلام پڑھے جانے کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''سوداؔ کے زمانے میں مرثیہ پڑھنے سے پہلے تعظیماً سلام
پڑھا جاتا تھا۔ خود اس نے ایک سلام کے خاتمے پر اس کی

طرف اشارہ کیا ہے:۔

یہ سودا عرض بہ عجز و نیاز کرتا ہے
شروع مرثیہ ہونے کو اب تمام سلام

سلام کے کہنے کا یہی مدعا تھا اور چونکہ ابھی اس کی ابتدا تھی
اس لئے اس میں جدت کے نئے نئے پہلو داخل نہیں
ہوئے تھے''۔۱۸؎

پروفیسر فضل امام نے سلام کو ایک نکھرے ستھرے رنگ کی غزل قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس میں حزنیہ، بینیہ اور المیہ مضامین پر توجہ دینا لازمی ہے:

''سلام کو ایک نکھرے ستھرے رنگ کی غزل تصور کرنا چاہئے۔ ہاں اس میں جو مرکزی موضوع پایا جاتا ہے اُس کا تعلق براہ راست مرثیہ سے ہے۔ اس لئے سلام میں حزنیہ، بینیہ اور المیہ مضامین پر توجہ دینا لازمی ہے۔ چنانچہ سلام صنف سخن اور چلن کے اعتبار سے جہاں منفرد رموز و نکات کا حامل ہے وہیں مرثیوں کا تتمہ یا دیباچہ بھی۔ اشتراک مضامین کے اعتبار سے بھی سلام اور مرثیے میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن عروضی ترکیب اور ہیئت کے نقطۂ نظر سے یہ غزل سے قریب ہے۔ اس لئے یہ منفرد صنف سخن کے ذیل میں آتا ہے۔ پھر بھی جہاں تک مضامین کے تنوع اور وسعت کا سوال ہے سلام، مرثیہ کی شاعری پر ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے''۔
۱۹؎

سلام کی ہیئت اور موضوعات کے سلسلے میں فضل امام کے خیالات و نظریات میں کافی

حد تک پختگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ان سبھی احساسات اور تجربات کو جو بیشتر محققین کے یہاں ناہموار اور بکھرے انداز میں ہیں، یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے سلام کو ''ایک نکھرے ستھرے رنگ کی غزل'' سے متصف کرنے کے ساتھ یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ اس کا مرکزی موضوع ''مرثیہ'' ہی ہے۔ یعنی مرکزی موضوع سے علیحٰدہ ہوکر کسی اور نقطۂ نظر سے اس کی مناسب اور برمحل تعریف ممکن نہیں۔

فضل امام کے خیال میں صرف عروضی ترکیب اور ہیئت ہی سلام کو غزل کے قریب لاتی ہے۔ رثائیت سے جدا کرکے صنف سلام کی تعریف اس کو اپنے اصل ہدف اور بنیادی مقاصد کی روح سے دور کردے گی۔

ہیئت اور مضامین کے اعتبار سے سلام اور غزل دونوں میں بہت حد تک یک نیت ہے۔ دونوں اصناف میں وزن اور قافیے کی مشترک ترکیب استعمال ہوتی ہے۔ دونوں ہی اصناف کے اشعار میں تسلسل کا پایا جانا ضروری نہیں۔ ان کا ہر شعر آزاد اور خود مکتفی ہونے کے ساتھ ساتھ معنی کے اعتبار سے بھی اپنی جگہ پر مکمل اور مستقل حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔

غزل میں خارجی اور داخلی دونوں ساختوں میں یکسانیت ہوتی ہے، اور خارجی نقطۂ نظر سے ہی داخلی معنی کی مراد و منشا کا تعین کیا جاتا ہے۔ لیکن سلام کی صرف خارجی ساخت غزل سے مطابقت رکھتی ہے۔ سلام کی داخلی ساخت کے مطالبات غزل کی داخلی ساخت کے مطالبات سے مختلف ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو یکسر مختلف ہوتے ہیں اور دونوں اصناف میں استعمال ہونے والے ایک ہی لفظ کے منشا میں بعد المشرقین جیسا فاصلہ ہوتا ہے۔

لائے رخصت کے لئے گھر میں جو عباس کو شاہ
باہیں گردن میں عجب پیار سے ڈالے آئے

سلام کا مرکزی موضوع اگرچہ رثائی ہوتا ہے۔ لیکن سلاموں میں اپنے ذاتی تجربات و احساسات اور قلبی واردات کے اظہار کی آزادی مرثیہ کے مقابلے میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے سلام کا دامن مرثیہ کے مقابلے میں غزل کی جیسی وسعت اور وسیع القلبی کا حامل ہوتا ہے۔لیکن جو الفاظ اور استعارے غزل میں کسی اور معنی اور مفہوم کی ادائیگی کرتے ہیں، سلاموں میں آنے کے بعد اپنے معنی اور مفہوم کے ارادے اور منشا کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ کیونکہ سلام گوئی کا محرک اللہ کے نزدیک برگزیدہ ہستیوں سے عقیدت ومحبت کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے، جسے غزلیہ شاعری میں بیان ہونے والے عشق کی عمومی تعریف سے ارفع اور بلندرصور کیا جاتا ہے، باوجودیکہ غزل کی مخصوص لفظیات، تراکیب، استعارے اور تمام ترفنی کمالات کی موجودگی سلاموں میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

مرثیہ گوئی کے فن میں شاری کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جن آداب کو ملحوظ رکھنا مرثیہ گوئی کے لئے لازم تصور کیا جاتا ہے انھیں بجالانا ہر شاعر کے لئے ممکن نہیں۔اس وجہ سے بیشتر شعرانے اپنے رثائی جذبات کے اظہار کے لئے مرثیہ گوئی کے بجائے سلام گوئی کی راہ اختیار کی کیونکہ اس صنف کے لئے غزل کی ہیئت اور لفظیات میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار ان کے لئے زیادہ آسان تھا۔

اگر چہ مسدس کی ہیئت مرثیہ گوئی کی لازمی شرطوں میں شامل نہیں ہے۔ ابتدا میں مرثیے مختلف ہیئتوں میں کہے جاتے تھے۔لیکن مرثیہ کا عنوان اس کے مطالبات اور مشکلات کو کچھ اس طرح سے بڑھا دیتا ہے کہ سوداؔ جیسے ماہرفن کو بھی یہ صنف ''دقیق ترین'' اور ''مشکل ترین'' نظر آئی۔ غالباً اسی لئے شعرانے مرثیہ گوئی کے فن کی مشکلات اور تقاضوں سے اپنا دامن بچا کر اس کے استعاروں کے وسیلے سے اپنے جذبات کو غزل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

غزل کی شاعری میں اگر چہ احساسات کے اظہار کی آزادی زیادہ حاصل ہے۔لیکن وہ مضامین اور قلبی واردات جن کے اظہار کی گنجائش غزلوں میں براہ راست ممکن نہیں، مرثیہ گوشعرا نے انھیں، تلمیحات اور استعاروں کے وسیلے سے مہذب پیرائے میں بیان کرنے کی راہ سلاموں میں نکال لی۔

مرثیہ کی ایک ذیلی صنف ہونے کے باوجود سلاموں میں غزل کے شعری وسائل اور

لفظیات کا آزادانہ استعمال کیا جاتا ہے۔اگر چہ ان نکات کی وضاحت گذشتہ صفحات میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو الفاظ اوراستعارے غزلوں میں کسی اور معنی اور مفہوم کی ادائیگی کرتے ہیں، وہی سلاموں میں آنے کے بعد اپنے پس منظر، پیش منظر اور اقتضائے حال کے مطالبات کے بہ موجب اپنے معنی اور مفہوم کو تبدیل کر لیتے ہیں۔یہی تبدیلی سلاموں کی شعریات کی تخلیق کرتی ہے۔

غالبؔ اپنی غزل اور انیسؔ اپنے سلام میں ایک لفظ ''شہ'' کا استعمال دو مختلف شخصیات یا استعاروں کے لئے کرتے ہیں:

غالبؔ۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

انیسؔ۔

قلم بھی رہ گیا ہر بار نکتہ دے کے ناخن پر
نہ سوجھی جب کوئی تشبیہ روئے شہ کے خالوں کی

موضوع کے بدلنے سے معنی میں کتنی تبدیلی آئی اس نکتہ کو ان دونوں اشعار کی مدد سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ایک ہی لفظ شہ دونوں اشعار میں استعمال ہوا ہے، لیکن داخلی صورت حال کے مختلف ہونے سے دونوں کے معنی اور مفہوم میں بھی انقلابی تبدیلی پیدا ہوگئی۔موضوع اور داخلی صورت حال کی تبدیلی نے معنی کو اس طرح تبدیل کیا ہے کہ غالبؔ کے یہاں ''شہ'' ایک دنیاوی بادشاہ ہے تو انیسؔ کی شعریات یا شعری اصطلاح میں ''شہ'' سے امام حسینؑ مراد لئے گئے ہیں۔

غزلوں اور سلاموں میں ایسے بہت سے مشترک الفاظ ہیں جو موضوع اور پس منظر کے بدلنے سے اپنے معنی بدل لیتے ہیں جیسے لفظ ''امام'' کا استعمال میرؔ کے اس شعر میں دیکھیں۔

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

اب غالبؔ کے سلام میں امام لفظ کا پس منظر ملاحظہ ہو۔

امام وقت کی یہ قدر ہے کہ اہل عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو

ایسے بے شمار الفاظ، ترکیبیں اور اصطلاحات ہیں جو دونوں اصناف میں مشترک طور پر بے تکلفی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے اپنے متناسب معنی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً حریم، جوبن، خال اور زلف و گیسو، دندان و لب وغیرہ۔

حریم حق میں جو پہنچے تو سر اٹھا کے کہا — خدا کی شان کہاں آ گئے کہاں سے چلے
آج کچھ کھلتا نظر آتا ہے جوبن مہر کا — غالباً بند نقاب روئے حیدر کھل گیا
لکھی شہ کے خال معنبر کی مدح — قلم نے ہمیں نکتہ داں کر دیا

سلامی وصف زلف شاہ خوش خو ہو نہیں سکتا
رہ باریک ہے دخل اک سرِ مو ہو نہیں سکتا

پڑا جو سایۂ گیسوئے پیچدار حسینؑ — تو ذوالجناح یہ سمجھا کہ تازیانہ ہوا

مدح دندان و لب شبیرؑ باہم چاہئے — شہد خالص میں حلاوت بے شکر ہوتی نہیں

غزلوں میں معشوق، محبوب، کافر، ظالم اور ستم گار کا استعارہ جو مفہوم ادا کرتا ہے، تقدیسی اور اعتقادی شاعری میں اسی لفظ محبوب اور معشوق سے مراد کبھی اللہ کے رسولؐ ہو جاتے ہیں اور کبھی امام حسینؑ اور کبھی دیگر اولیائے خدا۔ اسی طرح کافر اور ظالم و ستم گار کا لفظ جب غزلوں میں آتا ہے تو وہ دنیاوی اور مجازی معشوق اور محبوب کی کج ادائیوں کا استعارہ ہوتا ہے۔ لیکن مذہبی

اور اعتقادی اصطلاحات ان الفاظ کے معنی کو یکسر تبدیل کر کے ان کے لغوی اور شرعی معنی اور اصطلاحات پیش کرتی ہیں۔غزل کی شاعری میں، کافر، ظالم، ستم گار، اور اسی قبیل کے الفاظ کے حقیقی معنی مراد نہیں لیے جاتے، جبکہ مذہبی شاعری میں خالص حقیقی معنی ہی مراد لیے جاتے ہیں۔

کس موقع پر کون سا معنی مراد لیا جائے اس کا فیصلہ شعر کے مضمون اور موضوع کی نوعیت کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی کیفیت سے ہوتا ہے۔دونوں موقعوں پر مضمون، موضوع اور داخلی کیفیات کی تبدیلی سے الفاظ کی فطری تصویر بدل جاتی ہے۔یہیں سے سلام کے فن میں غزل کے ساتھ ساتھ مرثیہ اور دیگر اصناف سے امتیاز کا آغاز ہوتا ہے۔

سلاموں کے لئے ضروری ہے کہ اس میں غزل کی لفظیات کے ساتھ مرثیہ کے استعاروں کا استعمال کیا جائے۔اگر سلام میں مرثیہ کے استعاروں کا استعمال نہیں ہوا ہے تو سلام اور غزل میں امتیاز کرنا مشکل ہوگا۔اگر چہ بہت سی غزلوں میں کربلا کے استعاروں کا استعمال ہوتا ہے اور ساتھ ہی قلبی واردات کا اظہار بھی۔پھر بھی غزل کے وہ اشعار سلام قرار نہیں پاتے بلکہ غزل ہی رہتے ہیں، کیونکہ موضوع کی مناسبت اور داخلی کیفیت کے مطالبات کے سبب استعارات اپنے معنی اور مفہوم کو غزل کی اصطلاحات تک محدود رکھنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔

قصیدہ، مثنوی، غزل اور مرثیہ سبھی میں جذبات نگاری کو اہمیت حاصل ہے۔لیکن موضوع کا اختصاص اور اصطلاحات میں تبدیلی کی تفہیم ان اصناف کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔

انیسؔ کی غزلوں اور سلاموں کے کچھ اشعار ایسے ہیں جنھیں انھوں نے دونوں اصناف میں شامل کیا ہے۔جس قاری نے ان اشعار کو غزلوں میں پڑھا ہے وہ اسے غزل کا شعر تصور کرتا ہے اور جس نے سلام میں پڑھا ہے وہ انھیں سلام کا شعر سمجھتا ہے اور جس کی نظر دونوں اصناف میں ان اشعار پر پڑی ہے۔اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دونوں اصناف میں فرق کیسے کیا جائے؟ اس سوال کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ ان اشعار کے موضوع اور ان کی داخلی کیفیت کو دیکھا جائے۔یہی دونوں چیزیں اس بات کا تعین اور فیصلہ کریں گی کہ شعر کو کس صنف کے حصے میں رکھا جائے۔کیونکہ مرثیہ کے چہرے کو ہم اگر مرثیہ کی تعریف (Definition)

سے مطابقت کر کے دیکھیں تو وہ کسی پہلو سے مرثیہ کی صنف کے بنیادی مطالبات سے ہم آہنگ ہوتا نظر نہیں آئے گا۔

سلام میں غزل کی لفظیات کے استعمال کے باوجود مرثیہ کے کرداروں کی شمولیت اسے سلام قرار دینے کی راہ ہموار کر دیتی ہے۔ کیونکہ سلام گوئی کا مطمع نظر وہی ہے جو مرثیوں کا ہے۔سلام میں جو غیر رثائی الفاظ پائے جاتے ہیں وہ منفردہ کی ہیئت میں رثائی شاعری کی اُسی ترقی کا ایک حصّہ اور نشانی ہیں جو مرثیوں میں چہرہ اور سراپا کے طور پر نظر آتی ہیں۔

انیسؔ کے سلام ع ''سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو'' میں صرف ایک شعر ایسا ہے جو غزل کی لفظیات میں ہونے کے باوجود مرثیہ کے کرداروں کی شمولیت کے سبب اس نظم کو سلام کی صنف میں شامل کرتا ہے۔

بجا ہے اس لئے اکبرؑ سے تھا حسینؑ کو عشق
کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو

اگر اس شعر میں مرثیہ کے کردار شامل نہ ہوتے تو یہ سلام ایک عمدہ غزل ہوتا۔سلام میں غزل کی لفظیات کی شمولیت کی سہولت اور اپنے واردات قلبی کے اظہار کی آزادی کے سبب ہی غزل پسند مرثیہ گویوں اور مرثیہ پسند غزل گویوں نے اپنی تالیف قلب کے لئے اس فن کو ترقی دی۔

سلام کے فن کو ترقی دینے کا ایک بڑا فائدہ مرثیہ نگاروں کو یہ ہوا کہ انھیں اپنے مہذب عشقیہ جذبات کی تشفی کے لئے ایک شائستہ موضوع اور مناسب پلیٹ فارم مل گیا۔ اس طرح صنف سلام کی مسلسل ترقی نے مرثیہ گو شعرا کو غزل گوئی کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا۔

غزل گو شعرا کو سلام گوئی کے فن کی ترقی سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ مرثیہ گوئی کے فن کے دقائق اور مشکلات سے بچ گئے اور اپنے اعتقادی اور عقیدت مندی کے جذبات کو اشعار کی اسی ہیئت میں ڈھال دیا جس ہیئت اور سانچے میں ڈھالنے کے وہ ماہر اور مشاق تھے۔اس خیال پر سب سے معتبر گواہ غالبؔ کا سلام ہے۔

حوالہ (پہلا باب)

۱۔ اردو مرثیے کا ارتقاء۔ مسیح الزماں۔ ص: ۸۰۔

۲۔ انیس کے سلام۔ ص: ۲۱

۳۔ اردو مرثیے کا ارتقا بیجاپور اور گولکنڈہ میں ۱۷۰۰ء تک۔ ص: ۱۹۸، بحوالہ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ از محمد حسن

۴۔ چشمک — لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

تعلّی — نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیسؔ — جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

فخر و مباہات — سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو — ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

۵۔ اردو مرثیہ کی سرگذشت۔ ص: ۱۶۳

۶۔ انیس کے سلام۔ ص: ۱۷

۷۔ نقد و نظر (تنقیدی ششماہی) ص: ۱۰۱ تجزیہ سلام انیس۔ جلد ۱۱، شمارہ ۱، ۱۹۸۹ء۔

۸۔ المیزان۔ ص: ۴۸۵

۹۔ انیس: شخصیت اور فن۔ ص: ۳۷۷۔

۱۰۔ انیس: شخصیت اور فن۔ ص: ۳۷۸

۱۱۔ جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی۔ ص: ۱۵

۱۲۔ افسردہ، پناہ علی بیگ۔ ولادت: ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) وفات: ۱۲۵۰ (۱۸۳۴ء) تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ از امیر علی جونپوری۔ ص: ۱۱۲۔ مسیح الزماں نے لکھا ہے کہ ان کے سال پیدائش و وفات کا کہیں پتہ نہیں چلتا از اردو مرثیے کا ارتقا۔ ص: ۱۴۹۔

۱۳۔ آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ ص: ۳۶۶۔

۱۴ تنقیدی مطالعے۔ص:۱۵۴

۱۵ سلک سلام دبیر جلد دوم۔تقی عابدی۔ص:۵۹۔

۱۶ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۳۱۸

۱۷ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۱۸۸

۱۸ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۱۹۲

۱۹ انیس:شخصیت اور فن۔ص:۳۷۸

ا ولی ویلوری کے ہم عصر مشہور مرثیہ گو ہاشم علی ہیں۔جن کے متعلق دو غلطیاں مشہور ہوگئی ہیں۔ایک یہ کہ ہاشم علی کو''برہانپوری'' سمجھا گیا ہے۔دوسرے یہ کہ ہاشم علی ان کا نام مانا گیا ہے۔ان کے حالات کسی قدیم وجدید تذکرہ تاریخ میں نہیں ملتے۔ان کے مرثیوں کے جو مجموعے ہندوستان اور یورپ میں موجود ہیں ان میں بھی مفصل حالات نہیں ہیں۔مگر بعض شعروں سے بعض حالات دریافت ہوتے ہیں جن سے ان غلطیوں کی تصحیح ہوتی ہے۔ہاشم علی کا ایک شعر ہے۔

گجرات میں پڑے جب یہ مرثیہ کو یاراں

سن کر چلے ہیں رونے دکنی دکن کو اپنے ا

(ا نقش سلیمانی)

ان ہاشم علی گجراتی کا اصلی نام علی محمد خاں ہے اور ہاشم علی تخلص ہے۔مرکب تخلص (ہاشم علی) رکھنا بالکل خلاف عادت ہے۔یہ پورا نام ہوا کرتا ہے۔اسی سبب سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ یہی اصلی نام ہوگا۔ہر نظم و مرثیہ میں باالالتزام''ہاشم علی''ہی تخلص کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔مثلاً

شاعری میں یوں مقرر ہے تجھے ہاشم علی — جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط

تجھ کو ہاشم علی حسین سرور — ہر برس مرثیہ لکھاتے ہیں

(از حامد حسن قادری۔تاریخ مرثیہ گوئی۔ص:۱۹)

ا (ب) دکن میں گولکنڈہ اور بیجاپور سے اہم مرثیہ نگار گذرے ہیں۔نورالحسن نقوی تاریخ ادب اردو:ص:۴۵

۲۰ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۳۴۔

۲۱ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۳۴

۲۲ ولی دکنی محمد ولی نام،اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ولی دہلی بھی گئے تھے۔بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہاں ان کی بہت قدر رہوئی۔(جوہر سخن) ص:۹۸ محمد

فیضان نام،قوم سید، وطن ویلور (احاطہ مدراس) ہے۔ عالمگیر کے معاصر تھے۔ص:۸۲
جواہر سخن۔مرتب مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی۔۱۹۳۳ء۔ ہندوستانی اکیڈمی،صوبہ متحدہ، الہ آباد

۲۳۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۱۱

۲۴۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۱۱۔۱۰

۲۵۔ مرقع سخن۔ص:۳۶۔ مدیر عمومی۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔مطبوعہ۔اعظم اسٹیم پریس۔ چار مینار حیدرآباد دکن۔۱۹۳۵ء

۲۶۔ مرقع سخن۔ص:۳۷۔ مدیر عمومی۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔مطبوعہ۔اعظم اسٹیم پریس۔ چار مینار حیدرآباد دکن۔۱۹۳۵ء

۲۷۔ اردو مرثیے کا ارتقا۔ص:۸۴۔۸۳۔پہلی اشاعت ۱۹۶۸۔طباعت۔نظامی پریس لکھنؤ ناشر: کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ۔

۲۸۔ مرقع سخن۔جلد۔۔۔۔۔ مدیر۔محی الدین قادری زورؔ۔ص:۲۸۔

۲۹۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۳۷۶

۳۰۔ اردو مرثیے کا ارتقا بیجاپور و گولکنڈہ میں ۱۷۰۰ء تک۔ص:۱۹۸۔بحوالہ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ از محمد حسن۔

۳۱۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۵۷

۳۲۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:

۳۳۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۶۳

۳۴۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۶۴

۳۵۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۵۱۸

۳۶۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۳۸۲

۳۷ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۷۴

۳۸ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۷۶

۳۹ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۷۶

۴۰ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ص:۶۸۰

۴۱ انیس:شخصیت اورفن۔ص:۳۷۷

۴۲ انیس:شخصیت اورفن۔ص:۳۷۷

۴۳ کاشف الحقائق۔جلد دوم۔ص:۱۷۷

۴۴ کاشف الحقائق۔جلد دوم۔ص:۱۷۷

۴۵ مہذب اللغات۔جلد ششم۔ص:۴۵۱

۴۶ اردو مرثیے کا ارتقا بیجاپور وگولکنڈہ میں ۱۷۰۰ء تک۔ص:۱۹۸،بحوالہ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ ازمحمد حسن

۴۷ اردو مرثیے کی سرگذشت۔ص:۱۶۱

۴۸ انیس کے سلام۔ص:۲۵

۴۹ کاشف الحقائق۔جلد دوم۔ص:۱۷۷

۵۰ انیس کے سلام۔ص:۲۱

۵۱ انیس کے سلام۔ص:۲۲

۵۲ یکرنگ دہلوی،مصطفٰی خاں (شاعر) تلمذ:(۱) آرزوؔ دہلوی (۲) آبروؔ دہلوی۔وفات ۱۷۳۷ء۔از وفیات شاہرار دوص:۱۰۵۔بشارت علی خاں فروغ۔
سن اشاعت ۲۰۰۰ء مطبوعہ کلکتہ آفسیٹ پریس۔گنج میر خاں نئی دہلی۔۲

۵۳ نجم الدین عرف شاہ مبارک،ولادت گوالیار ۱۰۹۵ھ (۱۶۶۴ء) وفات: دلّی جمعرات ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ (۲۰/دسمبر ۱۷۳۲ء) مدفن: مزار سید حسن رسول نما، دلّی۔

از تذکرہ ماہ وسال مالک رام۔ص

۵۴ تذکرۂ شعرائے اردو۔ص:۲۱۷۔بہ تصحیح وتنقید۔مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مطبع:مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ میں طبع ہوا۔۱۹۲۲ء

۵۵ جواہرِ سخن۔ص:۳۱۳۔ازمولوی محمد مبین چریا کوٹی۔پہلی جلد:پہلا دور۔پہلا اور دوسرا حصہ سن اشاعت ۱۹۳۳ء،ہندوستانی اکیڈمی،صوبہ متحدہ،الہ آباد

۵۶ گلزار کی طرح ہے بیابان کربلا۔جواہرِ سخن۔ص:۲۲۰۔ازمولوی محمد مبین چریا کوٹی۔۵۷ انیسؔ کے سلام۔ص:۲۳

۵۸ تذکرۂ میر۔س:۳۷مصنفہ میر تقی میرؔ مترجمہ ایم کے فاطمی۔نکات الشعرا۔ص:۲۹گلشن ہند۔ص:۲۷۲۔تذکرۂ شعرائے اردو۔ص:۲۱۷صوبۂ متحدہ،الہ آباد۔

۵۹ کلیات سودا۔ص:

۶۰ انیس کے سلام۔ص:۲۴

۶۱ ضاحکؔ۔میر غلام حسین۔ولادت:دلی(۱۷۰۶ء۔۱۷۰۷ء۔۱۱۱۸ھ) وفات: فیض آباد۔(۱۷۸۲ء۔۱۱۹۶ھ)فرانسیسی مستشرق گارسان ڈی ٹاسی نے تاریخ وفات: ۱۱۹۸ھ لکھی ہے۔صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں فیض آباد میں موجود تھے اور وہیں انتقال کیاص: ۔۔۔۔علی احمد دانشؔ کے دادا میر علی محمد عارفؔ کی ایک نجی تحریری یادداشت کے مطابق میر ضاحک کا ۱۱۹۶ھ میں فیض آباد میں انتقال ہوا اور وہیں درگاہ میں دفن ہوئے۔از باقیات انیس۔اکبر حیدری۔ص:۱۵۵

۶۲ انیس کے سلام۔ص:۲۵۔

۶۳ تذکرہ شعرائے اردو۔ص:۱۳۳

۶۴ اسلاف واخلاف میر انیسؔ۔ص:۶۲

۶۵ تذکرۂ مرثیہ نگاران اردو۔امیر علی جونپوری ۔ص:

۶۶ اسلاف واخلاف میر انیس۔ص:۶۳۔

٦٧ انیس کے سلام۔ص:۲۵

٦٨ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ص:

٦٩ اسلاف واخلاف میر انیس:ص:٦٠

٧٠ انیس کے سلام۔ص:۲٦۔

٧١ انیس کے سلام۔ص:۲٦

٧٢ انیس کے سلام۔ص:۲٦

٧٣ تاریخ مرثیہ گوئی۔ص:۲۵۔

٧٤ المیزان۔نظیرالحسن فوقؔ۔ص:۴۸۵۔

٧٥ اردو مرثیہ کی سرگذشت۔اسدار یب۔ص:۱٦۴

٧٦ المیزان۔ص:۴۸۵۔

٧٧ آب حیات۔ص:

٧٨ آب حیات۔ص:

٧٩ آب حیات۔ص:۱٦۰۔اپریل۔۱۹٦۳ء

٨٠ قائم چاندپوری (محمد قیام الدین) (محمد قائم) (شاگرد ہدایتؔ ودردؔ وسوداؔ) ولادت: چاندپور (بجنور) ۱۳۳۵ھ/۱۳۳۸ھ ۱۷۲۲۔۱۷۲۳ء/۱۷۲۵۔۱۷۲٦ء وفات: رام پور ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳۔۱۷۹۴ء) مدفن: مقبرہ صاحبزادہ محمد یار خاں (پرانا مدرسہ) رامپور (کلیات قائم مرتبہ اقتدا حسین) از تذکرہ ماہ وسال۔ مالک رام



٨١ انیس کے سلام۔ص:۲۷

٨٢ انیس کے سلام۔ص:۲۷

٨٣ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ص:۴۸۸

٨٤ سن ولادت میں بہت اختلاف ہے۔ادیب نے لکھا ہے کہ "سال ولادت معلوم نہیں"۔ رام بابو سکسینہ نے سال ولادت ۱۱۴۰ھ لکھی ہے۔آصفؔ نے لکھا ہے۔"۱۷۲۳ء مطابق

۱۱۴۹ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے''۔ مقام ولادت میں کوئی اختلاف نہیں۔ (دہلی کے محلّہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے)۔ مالک رام نے عکس زار اور باقیات انیس کے حوالہ سے تاریخ ولادت (۱۷۴۰۔۱۷۴۱ء) ۱۱۵۳ھ لکھی ہے وفات ۲۴/ اکتوبر ۱۷۸۶ء یکم محرم ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ کے محلّہ پیر بخارا میں ہوئی۔ احاطہ مرزا علی خاں میں مرزا قاسم علی خاں کے باغ کی پشت پر دفن ہوئے۔

۸۵ اسلاف میر انیس۔ ص: ۱۰۵

۸۶ اسلاف و اخلاف میر انیس۔ ص: ۷۶۔۷۵

۸۷ آصف نے میر حسن کے چار بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مسعود حسن رضوی ادیب نے صرف تین بیٹوں کا ذکر کرتے ہوئے خلیقؔ کو حسنؔ کا منجھلا بیٹا لکھا ہے۔ از اسلاف میر انیس۔ ص: ۱۳۳

۸۸ اسلاف میر انیس۔ ص: ۱۳۹

۸۹ اسلاف و اخلاف میر انیس۔ ص: ۱۱۵

۹۰ ادیب نے لکھا ہے: یہ مجموعہ میرے عزیز شاگرد مرحوم سید محمد عباس آصفؔ ایم۔ اے۔ کو اپنے دادا میر سید علی مانوسؔ نبیرہ میر انیسؔ سے ملا تھا۔ معلوم نہیں اب یہ مجموعہ کہاں ہے۔ ص: ۱؛ آصف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے: ''ہم نے میر خلیقؔ کے سلاموں کو ترتیب دیا ہے اور خدائے تعالیٰ نے چاہا تو ''رباعیات انیس'' (مطبوعہ نول کشور) کی طرح یہ سلام بھی شائع ہو جائیں گے۔ لیکن مطبع والوں کی خواہش ہے کہ، میں پہلے میر انیسؔ کے سلام یکجا کر دوں بہر حال میر خلیقؔ صاحب کے سلاموں کی فراہمی کے ساتھ میں انیسؔ کے سلاموں کو بھی اکٹھا کر رہا ہوں۔

۹۱ اسلاف میر انیس: ص: ۱۴۸

۹۲ واجد علی شاہ نے ایک غزل کے مقطع میں خلیقؔ کے سلاموں کی گریہ خیزی کی طرف اشارہ کیا ہے:

حاسد حسد سے روئے جو اخترؔ تو کیا عجب

رتبہ ملے غزل کو سلام خلیقؔ کا (اسلاف میر انیس۔ ص: ۱۴۹)

۹۳ اَسلاف میر انیس۔ ص: ۱۴۸

۹۴ حیدری (سید حیدر بخش) (فورٹ ولیم کالج والے) ولادت: دلی ۱۱۸۲ھ۔۱۱۸۳ھ

(۱۷۶۸۔۱۷۶۹ء) وفات: بنارس۔۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳۔۱۸۱۴ء) (دیوان حیدری مرتبہ عبادت بریلوی۔ ازتذکرہ ماہ وسال۔ص:۱۳۹) حیدری نے ملاحسین واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہدا کا اردو ترجمہ گلشن شہیداں'' کے نام سے کیا تھا جو کربل کتھا کے بعد پہلا ترجمہ سمجھا جاتا ہے اسی کتاب (گلشن شہیداں) کا خلاصہ ''گل مغفرت'' کی شکل میں انھوں نے نظم کیا تھا۔

۹۵ مصحفی، غلام، ہمدانی۔ ولادت: ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۷ء) وفات: لکھنؤ: ۱۲۴۰ (۱۸۲۴۔۱۸۲۵ء)

۹۶ جرآت، شیخ یحیٰ امان قلندر بخش۔ ولادت: دلی، ۱۷۴۹ء۔ وفات: لکھنؤ، ۱۲۲۴ھ (۱۸۱۰ء)

۹۷ رنگین، سعادت یار خاں۔ ولادت: ۱۱۷۷ھ (جنوری: ۱۷۶۳ء)

۹۸ انیس کے سلام۔ص:۳۱

۹۹ اس جملہ سے ایسا لگتا ہے کہ غالب نے ایک سے زیادہ سلام کہے ہوں گے۔ لیکن ان کا صرف ایک ہی سلام دستیاب ہے۔ تقی عابدی نے لکھا ہے: ''غزل کے شہنشاہ غالب کا صرف ایک تین بند کا مرثیہ اور ایک سلام ہمارے اردو رثائی ادب کا جزو ہے''۔ (غالب دیوان نعت و منقبت۔ص:۶۶ شاہد پبلی کیشن دریا گنج نئی دہلی)

۱۰۰ اردو مرثیے کی سرگذشت۔ص: ۱۶۳۔

۱۰۱ اردو مرثیے کی سرگذشت۔ص: ۱۶۳

۱۰۲ فکر بلیغ۔ص: ۳۵۔ دلگیر کے اسی سلام پر مرزا دبیر نے مصرعے لگائے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے واقعہ کا بیان اس طرح کیا ہے: ''جس مجلس میں حضرت نے یہ خمسہ پڑھا تھا راقم حروف بھی حاضر تھا۔ مرزا صاحب بڑی عظمت سے دلگیر کا شعر پڑھ پڑھ کر اپنے مصرعے پڑھتے جاتے تھے۔ مجلس میں تعریفوں کے مارے کان پڑی آواز نہ آتی تھی''۔ (فکر بلیغ۔ص: ۵۳)

۱۰۳ دودمان۔ (ف) مذکر۔ خاندان۔ قبیلہ۔ کنبہ۔ دودمان اور خاندان میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جن سے نسل چلے۔ (نوراللغات جلد دوم۔ص: ۷۸۳)

۱۰۴ فکر بلیغ۔ص: ۳۶۔

۱۰۵ فکر بلیغ۔ص: ۳۷

۱۰۶۔ اردو مرثیے کی سرگذشت۔ص:۱۶۱۔

۱۰۷۔ مرزا سلامت علی دبیر۔حیات اور کارنامے۔ص:۱۷۵

۱۰۸۔ انیس: شخصیت اور فن۔ص:۳۷۶۔

۱۰۹۔ انیس: شخصیت اور فن۔ص:۳۷۷

۱۱۰۔ موازنہ انیس و دبیر۔ص:۳۳۶۔

۱۱۱۔ اردو مرثیے کی سرگذشت۔ص:۱۶۲

۱۱۲۔ سوداؔ۔شیخ چاند۔ص:۳۱۲

۱۱۳۔ سوداؔ۔شیخ چاند،ص:۳۱۲۔

۱۱۴۔ سوداؔ۔شیخ چاند۔ص:۳۱۳

۱۱۵۔ سوداؔ۔شیخ چاند۔ص:۳۱۳

۱۱۶۔ سوداؔ۔شیخ چاند۔ص:۳۱۳

۱۱۷۔ سوداؔ۔شیخ چاند۔ص:۳۱۳

۱۱۸۔ سوداؔ۔شیخ چاند۔ص:۳۱۳

۱۱۹۔ انیس: شخصیت اور فن۔ص:۳۷۷

دوسرا باب

سلام کی روایت

(الف)　صنف سلام کا آغاز اور رثائی موضوعات سے اس کا رشتہ۔

(ب)　ہیئت کے اعتبار سے سلام نگاری کا ارتقا اور موجودہ ہیئت کا تعین۔

(الف)

صنف سلام کا آغاز اور رثائی موضوعات سے اس کا رشتہ۔

اردو میں سلام گوئی کی ابتدا کا پتہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ۔ کیونکہ یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اس کا آغاز اردو مرثیہ گوئی کی ابتدا کے ساتھ ہوا۔ انیسؔ اور ان کے بعد کے شعرا نے خالص رثائی موضوعات سے تھوڑی سی علیحدگی اختیار کر کے جا بجا غزل کے رنگ کے اشعار سلاموں میں شامل کیے۔ اسی کے ساتھ واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ [1] کے باندھے جانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ زندگی کے عمومی مسائل و تجربات، غم و خوشی کے احساسات، عزیزوں کی بے اعتنائی اور قطع رحمی، دوستوں کی نارسائی اور ناسپاسی کا بیان بھی سلاموں میں کیا جانے لگا۔

مرثیہ کے لئے مسدس کی ہیئت طے پا جانے کے فوراً بعد کے سلاموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرانہ فن کاری کے مظاہرے اور شعری وسائل کے استعمال کے باوجود کلام میں رثائیت کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن اس دور کے بعد، خصوصاً انیسؔ کے عہد سے سلاموں میں شاعرانہ حسن اور فن کاری کے مظاہرے کے ساتھ سلاموں کے مضامین میں بھی خاصی جدت اور رنگینی پیدا ہوگئی۔ اس دور کے سلاموں کو (چند مستثنیات کے علاوہ) سامنے رکھکر سلام کی تعریف متعین کی جائے تو سلام صحیح معنوں میں غزل کا بدلا ہوا روپ اور اس کا قائم مقام نظر آئے گا۔ جیسا کہ نظیر الحسن فوقؔ اور اسد اریب نے لکھا ہے:

> ''اردو شاعری میں سلام غزل کا قائم مقام ہے''۔ [2]
>
> ''غزل کے سہمے ہوئے جذبے نے مرثیے میں سلام کا روپ دھار لیا''۔ [3]

روپ دھار لینے کی صلاحیت کی موجودگی ہی رثائی ادب کی بقا، اس کی ترقی اور مقبولیت

میں اضافے کی راہ ہموار کرتی گئی۔ یہ نکتہ ادب کی رثائی شاخ کی تفہیم تک ہی محدود نہیں بلکہ ادب کی ان جملہ اصناف پر محیط ہے جو انسان کی تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی زندگی سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر تعلق رکھتی ہوں۔ تبدیلی فطرت کا تقاضہ اور بشری جبلت کا خاصّہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ہمہ گیر ترقی کی ضامن بھی ہے۔ شارب ردولوی نے ادب میں نئی اصناف کے وجود میں آنے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کچھ نکتوں کی نشاندہی ان لفظوں میں کی ہے:

''ادب میں مختلف اصناف کا وجود بعض خاص تہذیبی، سماجی اور ذہنی اثرات کے تحت ہوتا ہے۔ مثنوی ہو یا مرثیہ، قصیدہ ہو یا ہجو، ہر ایک کے پیچھے وہ سماجی اسباب یا تہذیبی مطالبات ملیں گے جو اس خاص صنف کی پیدائش اور فروغ میں معاون ہوئے ہیں۔ اور یہی اثرات اس صنف کو مقبول یا نامقبول بنا رہے ہیں۔ اب اگر کسی صنف نے بعض خاص حالات میں اپنے کو تبدیل کرلیا، اور وقت کے نئے مطالبات کو سمونے کے لئے اپنے اندر ضروری تبدیلیاں کرلیں تو وہ صنف باقی رہی ورنہ وقت کے ہاتھوں کوئی نہیں بچتا''۔[۴]

غزل کی وسعت قلبی، کشادہ دامانی، قوت برداشت اور سخت جانی کا ذکر کرتے ہوئے شارب ردولوی نے لکھا ہے:

''غزل بھی خاص تہذیبی حالات میں پیدا ہوئی اور شاید اس نے سب سے زیادہ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی انقلابات، تغیر و تبدّل دیکھے۔ لیکن دوسری اصناف اور غزل میں یہی فرق ہے کہ جن تبدیلیوں اور انقلابات کو دوسری اصناف برداشت نہ کرسکیں، غزل انگیز کرلے گئی۔ اس کی وجہ اس کا لوچدار کردار تھا۔ جب جہاں جیسی ضرورت ہوئی ویسی شکل

اس نے اختیار کر لی''۔ ۵؎

شارب ردولوی نے جو خیالات غزل کے سلسلے میں ظاہر کیے ہیں وہ سلام پر بھی صادق آتے ہیں۔ کیونکہ سلام کی ہیئت اور موضوعات کے سلسلے میں جتنے خیالات اور رائیں پیش نظر ہیں ان میں ایک نکتہ جو سب میں مشترک ہے، وہ سلام کی کسی نہ کسی اعتبار سے غزل سے مماثلت اور مشابہت ہے۔ سلاموں کے سلسلے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن تبدیلیوں اور انقلابات کو مسدس مرثیہ قبول نہ کر سکا، سلام نے اسے بہت خوبصورتی کے ساتھ نبھایا۔

دور آغاز میں مرثیے اور سلام کی ہیئت اور موضوعات میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ سلاموں کے لئے صرف ایک تخصیص یہ برتی جاتی تھی کہ رثائی موضوعات کے ساتھ ساتھ درود و سلام بھی ضرور پیش کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بیجا پوری سلطنت کے مشہور مرثیہ گو مرزآ کے سلام کے پانچ شعر اپنی کتاب میں بطور نمونہ کے نقل کیے ہیں۔ مذکورہ اشعار پہلے باب کے صفحہ نمبر ۹ پر نقل کیے گئے ہیں۔

اے حسینِؑ علیؑ سلام علیک ....الخ

سلام گوئی کے ابتدائی دور میں سلام، سلامی، مجرا، مجرئی جیسے اصطلاحی اور علامتی الفاظ کا استعمال پابندی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ یہ الفاظ سلام گوئی کے طرز خاص کا جز سمجھے جاتے تھے اور ان کی موجودگی کسی نظم کے سلام ہونے کی دلیل تصور کی جاتی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ انیسؔ و دبیرؔ تک ہی قائم رہا۔ ان دونوں شعرا کے زمانے سے اس طرز میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، مضامین میں جدت کے ساتھ غیر رثائی موضوعات کی شمولیت بھی اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی۔

سلام جیسے جیسے فطری تقاضوں کے قریب آتا گیا، اس کی مقبولیت اور پذیرائی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مرثیہ گویوں اور مرثیہ خوانوں کی ضرورت بن گیا۔ اس بات کا ذکر کئی محققین نے کیا ہے کہ مرثیہ خوانی سے پہلے مجلس عزا کی فضا بنانے اور سامعین کو مرثیہ سننے کے لئے پوری طرح آمادہ اور تیار کرنے کی خاطر مرثیہ سے پہلے سلام پڑھے جانے کا رواج عام ہو گیا۔ ان

باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرثیہ کےطور پر وجود میں آنے والی یہ صنف اپنی ابتدائی شکل کے ترقی پالینے کے بعد سلام کے عنوان سے اپنا امتیاز اور تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب رہی، اور مجلسوں میں مرثیہ سے پہلے پیش خوانی کےطور پر پڑھے جانے کی ضرورت بن گئی۔

سلام گوئی کی ابتدا کے تعلق سے محققین کی متضاد رائیں ہیں۔علی جواد زیدی نے سلام گوئی کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ''پہلے واقعات کربلا سے متعلق جو کچھ بھی لکھا جاتا تھا وہ مرثیہ کہا جاتا تھا۔ بعد میں وہ سلام وجود میں آئے جن میں سلام ،السلام درود وسلام اور فاتحہ وغیرہ الفاظ کا التزام کے ساتھ استعمال ہونے لگا۔ یہ مرثیہ ہی کی توسیع تھی اور اسے علیحدہ صنف کا رتبہ نہ ملا تھا''۔[۶]

اس سلسلے میں انھوں نے کچھ نامور شعرا کا ذکر کیا ہے جنھوں نے سلام کی صنف کو اعتبار بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔لکھتے ہیں:

> ''سوداؔ و میرؔ جیسے اساتذہ کے یہاں اوراسی دور کے قائمؔ اور ضاحکؔ کے کلیات میں سلام کی موجودگی اس نئی ابھرتی ہوئی صنف کی ادبی اہمیت کی نشاندہی کرتی ہے''۔ [۷]
>
> میرؔ،سوداؔ،سکندرؔ ،احسانؔ، جیسے مرثیہ نگاروں نے مربع ،مستزاد،مخمس ،مسدس ،ترکیب بند وغیرہ شکلوں میں نسبتاً طویل مرثیے لکھ کر سلام اور مرثیے کے مابین ایک واضح خط کھینچ دیا، دھیرے دھیرے مسدس کی عروضی اور ہیئتی شکل مرثیوں کے لئے اور منفردہ یا غزلوں اور قصیدوں کی ہیئتی شکل سلاموں وغیرہ کے لئے مخصوص ہوگئی''۔[۸]

سلام گوئی کی ابتدا کے تعلق سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''اردو میں سلام کی ابتدا کب ہوئی اور پہلا سلام کس نے لکھا
اس بارے میں قطعی طور پر کہنا مشکل ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ
یہ صنف اردو میں ابتک تحقیق کی محتاج ہے''۔ ۹

اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ معلومات فراہم کی ہیں:

''اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب
شاہ متوفی ۱۰۲۰ھ کا کلیات آج بھی انڈیا آفس لائبریری لندن
میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی سلطان نے سب سے پہلے دکنی
زبان میں مرثیہ کہا اور مرثیے کے ساتھ ہی سلام بھی وجود میں
آیا، اگر چہ اس دور میں مرثیہ اور سلام کی کوئی خاص ہیئت اور
شکل وصورت معین نہ تھی۔ مرثیے اور سلام میں زیادہ فرق نہ
تھا۔ البتہ اس زمانے کے سلاموں میں رثائی موضوعات کے
ساتھ ساتھ ضرور، درود وسلام پیش کیا جاتا تھا''۔ ۱۰

تقی عابدی نے مثال میں مرزا کے سلام کے پانچ شعر نقل کرنے کے بعد اس دور کے سلاموں کی ہیئتوں کا ذکر کرتے ہوئے سلام کے مقاصد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''سلام اس زمانے میں قطعہ، مثلث، مربع، مثنوی
اور غزل کی ہیئت میں لکھے جاتے رہے اور صرف رثائی
موضوعات اور سلام و درود بھیجنا ہی ان کا مقصد تھا۔ یہ
سلسلہ رفیع سودا اور تقی میر تک جاری رہا''۔ ۱۱

علی جواد زیدی اور تقی عابدی دونوں نے محمد شاہ رنگیلے کے دور حکومت کو سلام گوئی کے لئے زریں عہد سے تعبیر کیا ہے۔ تقی عابدی نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد حکومت کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کے سلاموں کے موضوعات کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''دکنی سلاموں کے بعد میں جو کثیر تعداد میں سلام نظر آتے

ہیں وہ زیادہ تر محمد شاہ رنگیلے کے عہد سلطنت کے شاعروں
کے ہیں۔ شیخ ہدایت، سید عبداللہ مسکینؔ، غمگینؔ، خادمؔ،
جانفشاںؔ، علی فضلی، کرم علی، ناجیؔ وغیرہ کے سلام میں نعتیہ،
منقبتی، اعتقادی، رثائی اور بین کے موضوعات شامل ہونے
لگے اور سوداؔ، میرؔ، ضاحکؔ، افسردہؔ کے ہاتھوں میں پہنچ کر
سلام کی ادبی حیثیت سنورتی رہی، لیکن موضوعاتی کیفیت
میں زیادہ تبدیلی نہ ہوئی۔
ضاحکؔ، سوداؔ، میرؔ اور محبؔ کے کچھ اشعار ہماری اس گفتگو
کا ثبوت ہیں''۔[۱۲]

ڈاکٹر اسد اریب نے اپنی کتاب ''اردو مرثیے کی سرگذشت'' میں سلام گوئی کا موجد لکھنؤ
کے مرثیہ گوشعرا کو قرار دیا ہے:

''سلام کی صنف کے موجد لکھنؤ کے مرثیہ گو ہیں، جنھوں نے
مرثیہ میں غزل کے اسالیب کی بنیاد ڈالی۔ میر ضمیرؔ، دلگیرؔ اور
فصیحؔ کے سلام بہترین تخلیق خیال کیے جاتے ہیں''۔ [۱۳]

لکھنؤ کے مرثیہ گو سلام کی صنف کے موجد ہیں یا مرثیہ میں غزل کے اسالیب کی بنیاد رکھنے
والے، یہ دونوں باتیں مختلف ہیں۔ مرثیہ کو غزل کے اسلوب میں ڈھالنے کی بات کو لکھنوی مرثیہ
گویوں سے منسوب کرنا تو صحیح ہوسکتا ہے لیکن لکھنؤ کے مرثیہ گوشعرا کو سلام کی صنف کا موجد کہنا قرین
قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ صنف سلام میں طرز جدید کے موجد لکھنؤ کے مرثیہ
گوشعرا ہیں، اور اس صنف کو مقبول بنانے کا سہرا بھی خالصتاً انھیں کے سر ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، علی جواد زیدی کی تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سلام گوئی کی
روایت اس سے زیادہ قدیم ہے جتنی اسد اریب کی تحریر سے ظاہر ہوتی ہے۔ زیدی صاحب کی
نظر میں سلام گوئی کی صنف کی روایت ضمیرؔ، دلگیرؔ اور فصیحؔ کے عہد سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ وہ

لکھتے ہیں:

''اردو کے قدیم ترین سلام جو شمالی ہند میں ابتک میری نظر سے گذرے ہیں وہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں''۔ ۱۴

پروفیسر فضل امام نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے:

''اردو شاعری میں سلام کی روایت شروع سے ہی ملتی ہے۔اس لئے اس صنف سخن کا صرف انیسؔ و دبیرؔ کو موجد ٹھہرانا غلطی ہے''۔۱۵

فضل امام نے بھی سلام نگاری کے سلسلے کو جنوبی ہندوستان سے جوڑتے ہوئے لکھا ہے:

''اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو میں سلام نگاری کا سلسلہ بھی جنوبی ہند سے شروع ہوتا ہے اور ولیؔ دکنی کے کلیات میں اس کے نمونے ملتے ہیں''۔ ۱۶

جبکہ ایک موقع پر فضل امام نے صنف سلام کے آغاز کے تعلق سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کچھ نکتوں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''اگر چہ سلام گوئی کی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوسکی۔لیکن اتنا تو واضح ہے کہ سلام بھی وہی عروضی ترکیب اور ہیئت رکھتا ہے جو غزل کے ساتھ مخصوص ہے۔فارسی میں سلام نگاری کی روایت ملتی ہے۔یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اردو سلام گوئی نے فارسی سلام نگاری کی روایت سے کسب فیض کیا ہو''۔۱۷

اسد اریب نے سلام گوئی کا موجد لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا کو قرار تو دیا ہے، لیکن اپنی کتاب میں اس کا کوئی نمونہ ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا ہے، نہ ہی کسی اور قسم کی دلیل اپنے دعوے کو

مضبوطی فراہم کرنے کے لئے دی ہے۔ اس کے برعکس علی جواد زیدی نے محمد شاہی دور کے شاعر مسکیؔن کے سلام کے نمونے درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محمد شاہی دور کے مرثیہ گویوں میں نمایاں نام مسکیؔن اور فضلؔی کے ہیں۔ مسکیؔن کے بہت سے مرثیے اور کچھ سلام محفوظ رہ گئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:

اگر سلام کہوں میں تمام قدرت کا
ادائے حق نہیں شاہا تری طبیعت کا
سلام حرف مرکب ہے چار حرف ستیں
میں اس میں کیا کہوں کچھ حق تری حقیقت کا

اے مدینے کے ستارے السّلام　　کربلا کے سرا تارے السّلام
یا شاہ جتے تن ہیں تمہیں کرتے ہیں سلام　　کیا روح کیا بدن ہیں تمہیں کرتے ہیں سلام''[۱۸]

مسیح الزماں کی تحقیق سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ درگاہ قلی نے مرثیوں کے علاوہ سلام کے عنوان سے بطور خاص شعر کہے تھے۔ مسیح الزماں کے انکشاف سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ درگاہ قلی خاں کے زمانے میں سلام ایک منفرد اور باضابطہ صنف کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ ان حقائق کے انکشاف کے سہارے اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہو گیا کہ ''سلام گوئی کا فن اور اس کی روایت'' تقریباً تین سو سال پرانی ہے۔

مجموعی طور پر سلام گوئی کی تاریخ میں درگاہ قلی کا نام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ابتک جن قدیم رثائی اشعار کو سلام کے نام سے موسوم کیا گیا ان میں اس سبب سے اختلاف کا پہلو نکلتا ہے کہ کسی نے ان اشعار کو مرثیہ کے عنوان سے نقل کیا ہے اور کسی نے انھیں سلام کا نام دیا ہے۔ جبکہ مسیح الزماں کی تحقیق کے مطابق سر سالار جنگ کے کتب خانہ میں صرف سلام کے عنوان سے درگاہ قلی کے اکیس سلام موجود ہیں۔ یہ انکشاف سلام گوئی کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اردو ادب

کی تاریخ میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

ہیئت کی پابندی سے آزاد وہ رثائی اشعار جو کبھی مرثیہ تصور کیے جاتے تھے، اسی آزادی نے انھیں آگے چل کر موجودہ دور کے سلاموں سے قریب کر دیا۔ وہ منفرد مرثیے جو ''ہیئت کی آزادی'' کے زمانے میں وجود میں آئے، مرثیہ کی ہیئت کی باضابطہ تعیین کے بعد مرثیہ کی صنف سے خارج نظر آنے لگے۔

****

(ب)

ہیئت کے اعتبار سے سلام نگاری کا ارتقا اور موجودہ ہیئت کا تعین۔

ہیئت کے اعتبار سے سلام نگاری کے ارتقا کے بارے میں محققین کی آرا کا نچوڑ یہ ہے کہ مرثیہ اور سلام دونوں ایک ہی وقت میں وجود میں آئے۔ اس کے بعد مرثیے اور سلام دونوں کی ترقی معمولی فرق کے ساتھ متوازی طریقے سے ہوتی رہی۔ مرثیہ کے لئے ایک مخصوص ہیئت کا تعین ہو جانے کے بعد غزل کی ہیئت میں کہے جانے والے رثائی اشعار سلام کی صنف کے ساتھ مخصوص تصور کیے جانے لگے۔ گذشتہ باب میں سلام اور مرثیے کی ہیئت پر کی گئی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ زمانے میں کچھ مخصوص رثائی موضوعات کی شمولیت اور بعض غیر رثائی موضوعات کی رعایتوں کے ساتھ ہیئت ہی سلام اور مرثیے کے الگ الگ صنف کے طور پر پہچانے جانے کا ذریعہ ہے۔ سلام کی صنف کے ارتقا اور موجودہ ہیئت کے تعین کی منزل تک کا سفر تقریباً دو سے تین سو برس کے عرصہ پر مشتمل ہے۔

اس تعلق سے فضل امام اور تقی عابدی نے یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ تحریر کی ہے کہ:

> ''اردو شاعری کی تاریخ میں سلام شروع ہی سے ملتا ہے''۔ ۱۹

لیکن دونوں محققین میں سے کسی نے اپنے دعوے کو مستند بنانے کے لئے کوئی ثبوت، دلیل یا حوالہ پیش نہیں کیا ہے۔ اس بات کی صراحت بھی نہیں کی ہے کہ سلام گوئی کا ایک الگ صنف کی حیثیت سے آغاز کب ہوا اور کچھ مخصوص اشعار کو سلام کے نام سے کس دور میں موسوم کیا گیا۔ تقی عابدی نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حوالے سے صرف اتنا لکھا ہے کہ:

> ''اسی سلطان نے سب سے پہلے دکنی زبان میں مرثیہ

کہا اور مرثیے اور سلام کی کوئی خاص ہیئت اور شکل وصورت
معین نہ تھی''۔[۲۰]

ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مرثیے اور سلام کی ہیئت اور شکل وصورت معین نہیں تھی تو اس بات کا فیصلہ کیسے ہوگا کہ کن اشعار کو مرثیہ کہا جائے اور کسے سلام۔ کیونکہ محمد قلی قطب شاہ اور ان کے علاوہ دوسرے مرثیہ کہنے والوں کے کلیات اور مجموعوں میں جو اشعار مرثیہ کے عنوان سے درج ہیں ان کی ہیئت آج کے سلاموں کی طرح ہی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کے مرتب کردہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ (سن اشاعت ۱۹۴۰ء/۱۳۵۹ھ) اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے مرتب کردہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ (سن اشاعت ۱۹۸۵ء) میں حمد، نعت، منقبت، مدح، مناجات، عید میلاد النبی، مرثیہ اور نوحہ (فارسی) سب کی ہیئت ایک جیسی ہے اور سلام کے عنوان سے نظم ونثر میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

محققین کا عام تاثر یہ ہے کہ ''سلام عموماً غزل کے طرز پر کہے جاتے ہیں''۔لیکن فضل امام نے خصوصیت کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ابتدائی دور میں اس بات کی تخصیص نہیں تھی کہ سلام ''غزل'' کے طرز پر ہی لکھا جائے۔اس سلسلے میں انھوں نے قدیم شعرا کے کلام کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

سلام کی غزل سے مشابہت اور مماثلت کی بات بار بار کی جاتی رہی ہے۔میر انیسؔ غزل گوئی کے تعلق سے ان کے والد کی نصیحت کہ ''اب غزل کو سلام کرو'' بھی مختلف تذکروں میں ملتی ہے۔اس بات کو محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اس طرح لکھا ہے:

''ابتدا میں انھیں (انیسؔ کو) بھی غزل کا شوق تھا۔
ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے اور غزل بھی پڑھی۔وہاں
بڑی تعریف ہوئی۔شفیق باپ (خلیقؔ) خبر سن کر دل میں باغ
باغ ہوا۔مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کہاں گئے
تھے۔انھوں نے حال بیان کیا۔غزل سنی اور فرمایا کہ بھائی!

اب اس غزل کو سلام کرو، اور اُس شغل میں زور طبع صرف
کرو، جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادتمند بیٹے نے اسی دن
ادھر سے قطع نظر کی اور تمام عمر اسی میں صرف کر دی''۔ ۲۱

محمد حسین آزاد کے نقل کردہ میر خلیق کے فقرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فضل امام لکھتے ہیں:

'' کہنے کو تو ایک واقعہ ہے لیکن اگر اس کے
لفظوں پر غور کیا جائے تو بڑا بصیرت افروز نتیجہ برآمد ہوگا۔ یعنی
خلیق نے انیس سے کہا کہ '' اب اس غزل کو سلام کرو''۔
ذو معنی ہے۔ غزل چھوڑ دو یا غزل کو سلام بنا ڈالو۔ بہر کیف
خلیق کا مشورہ اور انیس کی سعادت مندی نے صنف سلام کو
مزید توانائی اور تقویت عطا کی''۔ ۲۲

اٹھارہویں صدی کے قابل ذکر مرثیہ گو شاعر درگاہ قلی خاں کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے اکیس سلام سرسالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان میں دس سلام مربع شکل میں ہیں۔ ۲۳

درگاہ کے کچھ سلاموں کا مربع شکل میں ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ درگاہ قلی کے زمانے میں سلام ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ ابتدا میں جس طرح مرثیے کی کوئی مخصوص ہیئت معین نہیں ہوئی تھی اسی طرح سلام کے لئے بھی کسی مخصوص ہیئت کا تعین نہیں ہوا تھا۔ سلام مختلف ہیئتوں میں کہے جاتے تھے۔ گویا مرثیوں کی طرح سلام کی ہیئت بھی بہت بعد میں طے ہوئی۔ درگاہ قلی نے سلام اور مرثیے دونوں صنفوں میں ہیئت کے تجربے کیے۔ مسیح الزماں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' شکل کے اعتبار سے ان میں بارہ مرثیے مربع ہیں
اور صرف ایک مفردہ باقی مخمس، مثمن، دہرہ بند، مسدس، ترجیع
بند ہیں''۔ ۲۴

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے مرثیہ گو شاعر شاہ برہان الدین جانمؔ ۲۵ کا ایک مرثیہ جو منفردہ کی شکل میں ہے اس کی ہیئت موجودہ زمانہ کے سلاموں سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس مرثیہ کی ابتدا محرم کے چاند کے ذکر سے ہوتی ہے۔ لیکن فوراً ہی شاعر تکوین عالم کی صوفیانہ تعبیر کی طرف آ جاتا ہے۔ لیکن روئے سخن کا مقتضٰی امام حسینؑ کا غم کرنے کی جانب ہی ہے۔ جانمؔ ان اشعار میں انسان کی تخلیق کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ خدا نے حضرت آدمؑ کی نسل کو امام حسینؑ کی شہادت پر غم کرنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ ۲۶ پروفیسر محمد حسن نے ان اشعار کو نقل کرتے ہوئے ان کے سلسلے میں لکھا ہے:

''حسن تعلیل سے وہ پوری دنیا کو امامؑ کا سوگوار بتاتے ہیں۔ اردو مرثیے کی تاریخ میں یہ تنہا مرثیہ ہے جس میں تصوف کے نازک نکات بیان کیے گئے ہیں''۔ ۲۷

مرثیوں میں عموماً تصوف کے مسائل بیان نہیں ہوتے ہیں۔ اگر چہ بہت سے دوسرے مسائل و معاملات مثلاً قدرتی مناظر اور اخلاقیات کا بیان خاص طور سے پایا جاتا ہے۔ برہان الدین جانمؔ کے اس مرثیہ کے بارے میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے:

''یہ تنہا مرثیہ ہے جس میں تصوف کے نازک نکات بیان کیے گئے ہیں''۔ ۲۸

یہی وصف اس مرثیہ کو دیگر مرثیوں سے ممتاز کرتا ہے اور اس کو سلام سے قریب لے جاتا ہے۔ اس طرح کے مرثیوں کو سلام کی ابتدا کی داغ بیل کہا جا سکتا ہے ۔

محرم کا چندر پھر کھن پولے ماتم ہوا پیدا

محباں کے دلاں میں سب شہاں کا غم ہوا پیدا

دکھی ہوا حدیت میانے نکل وحدت منے آنے

یو غم عالم کوں دکھلانے صفی آدمؑ ہوا پیدا

احد وحدت میں احمد ہو ہوا ظاہر محمدؐ ہو

حسین سرور کیرا جد ہو یو اسم اعظم ہوا پیدا

مدینہ علم جوں سرور علیؑ تھے باب جوں رہبر

سو معنی علم کا مظہر شہ اکرم ہوا پیدا

کہوں کیا حال عالم کا کلیما بول خاتم کا

(کلمہ)

و لے اس اسم اعظم کا نہ کوئی محرم ہوا پیدا

حسینا گئے ہیں اس رہ پر سوا ضح کیوں ہے گم رہ پر

سمایا جیوں کھڑیا شہ پر سوا ایسا کم ہوا پیدا

ہوا ماتم رسولؐ اوپر علیؑ پر ہور بتول اوپر

نین نرگس کے پھول اوپر انجو شبنم ہو پیدا '' ۲۹

یہ اشعار پروفیسر محمد حسن نے مرثیہ کے عنوان سے درج کیے ہیں۔ اگر چہ ان کی ہیئت سلام کی ہے۔ پورے کلام میں ایک دو شعر کے علاوہ ہر شعر میں سوز و گداز کی کیفیت ہے اور سارا کلام رثائی احساس سے بھرا ہوا ہے۔

پروفیسر محمد حسن نے کئی موقعوں پر مختلف شعرا کے مرثیوں کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ''مرثیہ'' غزل نما ہے یا غزل کی ہیئت میں ہے۔ مقیمی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''مقیمی کا مرثیہ غزل کی ہیئت میں ہے اور آٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور محرم کے چاند کی الم انگیزی کو بیان کرتا ہے''۔ ۳۰

محمد حسن کے بیان سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس غزل نما مرثیہ میں واقعۂ کربلا سے وابستہ غم والم کا بیان ہے۔ کربلا کے مصائب کے علاوہ دوسرے کسی مضمون کو اس مرثیہ میں جگہ دینے کی شعوری کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مرثیہ کا موضوع خالص رثائی ہے۔

قدیم مرثیہ گوشعرا کا بنیادی مقصد واقعۂ کربلا اور اس مختلف کرداروں کے فضائل اور مصائب بیان کرنا اوران کی الم انگیز شہادت پر رنج وغم کے لئے گریہ کا سامان فراہم کرنا تھا۔ ہیئت اورفن ان مراثی میں ثانوی درجہ رکھتے تھے۔ محمد حسن نے کئی شعرا کے غزل نما مرثیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خصوصیات کواس طرح بیان کیا ہے:

''امین بجلی خاں کے مراثی غزل کی ہیئت میں ہیں اور مختصر ہیں، ملک خوشنود کے تینوں مرثیے بھی غزل کی ہیئت میں ہیں۔ شاہی کے مراثی کی البتہ ایک الگ حیثیت ہے مگر یہ بھی مختصر ہیں اوران کا مقصد محض رنج وغم کا اظہار ہے اس میں نہ پلاٹ ہے نہ رزمیہ عناصر، شعریت بھی شاہیؔ کی دوسری تخلیقات کے مقابلہ میں کم ہے............شاہ ملک کا مرثیہ بھی غزل نما ہے۔[۳۱]

ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے مرثیوں میں یا مجموعی طور پر رثائی شاعری میں پوری توجہ واقعۂ کربلا کو نظم کرنے اوراس کے مصائب وآلام کو بیان کرنے پر صرف کی جاتی تھی۔ یعنی موضوعات کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، ہیئت وہی استعمال ہوتی تھی جو دیگر اصناف کے لئے رائج تھی۔ عموماً قدیم مراثی کی ہیئتوں میں غزل کی ہیئت کو غلبہ حاصل تھا۔

پروفیسر محمد حسن نے غزل کی ہیئت میں نصرتی [۳۲] کے سولہ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کے پانچ اشعار نقل کیے ہیں۔ یہ مرثیہ بھی غزل کی ہیئت میں ہے:

''نصرتی کا سولہ اشعار پر مشتمل ایک نا تمام مرثیہ ملتا ہے۔ جس میں امام حسینؑ کی فضیلت کا تذکرہ ہے اس مختصر مرثیہ کی اہمیت ہے تو صرف اتنی کہ نصرتی نے واقعہ کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے اوراسی میں مرثیہ پن پیدا کیا ہے۔''[۳۳]

نصرتی کے مرثیے کا نمونہ یہ ہے:

ویسے مین جبرئیل امیں ان کی شہادت کی خبر دیتے سو حضرت دل میں دکھ پائے ادک آزار کا

پوچھے نہ رہ سک فاطمہ اے نو بہار لطف رب تج دل کے گل کوں کہہ توں آزار آ پڑیا خار کا

بولے کہ ایسا وقت کب ہوگا نا میں ہوا نہیں نا مرتضیٰ بھی ہوں گے تب حملہ اک خونخوار کا

یوں سرو بالا کاٹ کر سب خانداں کے باغ میں چھوڑے لہو کی ندیاں خوں اچھا یک بار کا

تب فاطمہ زاری میں آ بولے کہ جب کوئی یاں نہ ہوئے

اے وائے کناں ماتم کرے اس سرو خوش رفتار کا ۳۴

پروفیسر محمد حسن نے غواصی (وفات ۳۱۔۱۶۳۰ء) ۳۵ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے چھ مرثیوں میں ایک 'نوحہ' ہے ایک 'واویلا'۔ پہلے انھوں نے سبھی چھ کو مرثیہ قرار دیا' اس کے بعد ان میں سے دو طرح کے کلام کا الگ انداز سے تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک کو 'نوحہ' اور دوسرے کو 'واویلا' کے نام سے موسوم کیا۔ اگر چہ محمد حسن نے ان مرثیوں کی ہیئت کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، لیکن ان کے دوسرے تبصروں کی روشنی میں دیکھا جائے تو باقی مرثیوں کو اگر وہ غزل کی ہیئت میں ہوں تو انھیں سلام کی صنف میں شامل یا اس سے قریب تر قرار دیا جا سکتا ہے۔ غواصی کے مرثیوں کی فنی اور ادبی حیثیت پر پروفیسر محمد حسن نے یہ تبصرہ کیا ہے:

> ''غواصی کے چھ مرثیوں میں ایک نوحہ ہے اور ایک واویلا۔ ان میں سادگی اور اثر آفرینی موجود ہے لیکن ان میں مضمون آفرینی اور تخیل کی نادرہ کاری موجود نہیں ہے حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو دین کی خاطر ان کی قربانیوں پر خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اظہار رنج و غم کیا گیا ہے لیکن واقعات کربلا کو کسی مربوط انداز میں نظم نہیں کیا گیا اور

بعد کے مراثی کے طرز واسلوب کی کوئی بنیاد ان میں نہیں ملتی''۔۳٦

غزل کے طرز کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے۔ ایک شعر کا دوسرے شعر سے رابطہ یا تو بالکل نہیں ہوتا یا برائے نام ہوتا ہے۔ محمد حسن نے یہی صفت غواصؔی کے مرثیوں کی بیان کی ہے جو رثائی شاعری میں سلام کی بیان کی جاتی ہے۔۳۷ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غواصؔی کا مذکورہ رثائی کلام ''سلام'' کی ابتدائی صورت تھی۔ آگے چل کر اسی طرز کے رثائی کلام نے سلام کی حتمی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح کی مثالیں دوسرے شعرا کے یہاں بھی ملتی ہیں۔

سلام گوئی اپنے ابتدائی دور میں اتنی مقبول اور وقیع نہیں ہوئی تھی کہ ہر مرثیہ گو شاعر سلام کی صنف میں ضرور طبع آزمائی کرتا۔ چند شعرا کے علاوہ قدیم مرثیہ گویوں میں کسی کے یہاں سلام گوئی کے نمونے خصوصیت کے ساتھ نہیں ملتے۔ درگاہ قلی خاں سالار جنگ، ولؔی دکنی، میر تقی میرؔ، میر محمد تقی گھاسؔی، سوداؔ، فضلؔی، مسکیؔن، اور ضاحکؔ کے علاوہ قدیم شاعروں میں کسی کے یہاں سلاموں کے باضابطہ نمونے نہیں پائے جاتے۔ مسیح الزماں نے درگاہ قلی خاں کی سلام گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''سرسالار جنگ کے کتب خانہ میں ان کے انیس مرثیے اور اکیس سلام ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ گوئی کے میدان میں صرف حصول ثواب کی نیت سے نہیں رکھا بلکہ اس میدان میں اپنی طبیعت کا زور دکھایا ہے۔ حسن اتفاق سے ان مرثیوں پر سال تصنیف پڑا ہوا ہے۔ یہ مرثیے ۱۱٦۷ھ۔۱۷۵۳ء سے لے کر ۱۱۸۰ھ۔۱۷٦٦ء تک میں لکھے گئے ہیں۔ شکل کے اعتبار سے ان میں بارہ مرثیے مربع ہیں اور صرف ایک مفردہ باقی مخمس، مثمن دہرہ بند، مسدس، ترجیع بند ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن میں عربی فارسی

یا بھا کا کے دو دو مصرعے دہرہ بند کے طریقے سے آتے ہیں۔

سلاموں میں بھی دس مربع کی شکل میں ہیں''۔ ۳۸

مسیح الزماں کی تحقیق نے مرثیے اور سلام دونوں اصناف کی ہیئت کے تعین کے مرحلے کو آسان کر دیا ہے۔ انھوں نے مرثیہ کی ہیئتوں کا ذکر کرتے ہوئے مربع، مفردہ، مخمس، مثمن دہرہ بند، مسدس اور ترجیع بند کا ذکر کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ مرثیہ کی صنف کا تعین ہیئت سے نہ کر کے اس کے موضوعات سے کیا گیا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ اہمیت اس بات کو دی گئی ہے کہ شاعر نے اپنی تخلیق کو خود کیا نام دیا ہے۔ مسیح الزماں نے اکیس سلاموں میں دس کو مربع کی شکل میں بتایا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلام کی صنف صرف مفردہ یا غزل کی ہیئت تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ صنف بھی ایک سے زیادہ ہیئتوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ مسیح الزماں کی تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ۱۷۵۳ء سے پہلے سلام مفردہ کے علاوہ مربع اور دوسری ہیئتوں میں عام طور پر کہے جاتے تھے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو مفردہ یا غزل کی ہیئت میں کہے جانے والے مرثیے صرف اپنی ہیئت کے مفردہ کی شکل میں ہونے کے باعث سلام کی صنف میں شمار نہیں کیے جاسکتے۔ کیوں کہ محمد شاہ رنگیلے ۳۹ کے عہد حکومت تک شعرا خصوصاً مرثیہ کہنے والے شعرا سلام کی صنف سے باقاعدہ واقف ہو چکے تھے۔ ۴۰ اس طرح محمد شاہ رنگیلے کے عہد حکومت سے پہلے مفردہ مرثیوں میں تو سلام کے آثار تلاش کیے جاسکتے ہیں لیکن ۱۷۴۸ء کے بعد کے مفردہ مرثیوں میں ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس دور کے کم سے کم آٹھ عہد ساز شاعروں نے سلام کی صنف کا تعین باضابطہ طور پر کر دیا تھا، جن کے ناموں کا ذکر گذشتہ صفحہ میں ہوا ہے۔ صلاحؔ کی مرثیہ گوئی کے سلسلے میں لکھتے ہوئے مسیح الزماں نے ان کے مرثیوں کی ہیئت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''اس قسم کے مرثیوں میں ۶۸ صلاح کے ہیں اور انھیں

کو اس عہد کا نمائندہ سمجھنا چاہئے۔ ان میں دو مثنوی ایک مخمس اور

باقی غزل یا قصیدے کی شکل میں ہیں اور مختصر ہیں''۔ ۴۱

صلاحؔ کے مرثیوں کی ان ہیئتوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں مرثیے کئی ہیئتوں

میں کہے جاتے تھے۔ہیئتوں کی تبدیلی سے صنف کی تعیین میں فرق واقع نہیں ہوتا تھا۔اس طرح جو اشعار سلام کے عنوان سے کہے گئے اگر ان کی ہیئت منفردہ کے علاوہ کچھ اور ہے تو اس سے بھی اس کی صنف کی تعیین پر حرف نہیں آئے گا اور وہ سلام ہی شمار کیے جائیں گے۔

ایک اور موقع پر کربل کتھا میں فضلی کے مرثیوں کی شمولیت کے بارے میں مسیح الزماں نے لکھا ہے:

''کربل کتھا میں روضۃ الشہدا کے جن اشعار کا فضلی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے وہ بیشتر مثنوی کی شکل میں ہیں۔ان کے علاوہ انھوں نے اپنے مرثیوں کے بہت سے حصے داخل کیے ہیں۔جو مربع اور مفردہ ہیں''۔۴۲

فضل علی فضلی نے کربل کتھا ۱۷۳۲ء۔۱۱۴۵ھ میں لکھی ۴۳ اس کتاب میں انھوں نے اپنے مربع اور مفردہ ہیئت کے مرثیے شامل کیے ہیں۔مفردہ مرثیے مربوط اور سلسلہ وار ہیں۔اس وجہ سے مفردہ کی ہیئت میں ہونے کے باوجود انھیں سلام کی ابتدائی شکل سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں سلام گوئی نے باقاعدہ صنف کی حیثیت سے رواج نہیں پایا تھا۔فضلی کے مفردہ مرثیے کے اشعار اس طرح ہیں۔

ماں اس کی کئی دنوں سے از بسکہ فاقہ کش ہے	سوکھا ہے دودھ اس کا بن دودھ اب یہ غش ہے
کچھ نہیں مرض اب اس کوں جو کچھ ہے سو عطش ہے	اس منہ چوانا پانی اب حج اکبری ہے
پیاسوں یہ منہ بیاسا اب کھول رہ گیا ہے	گردن ڈھلا دیا ہے دیدے پھرا دیا ہے
مرتا ہے کوئی دم میں، دم اک رمق رہا ہے	جیو دان دوگے اس کوں یہ رحم گستری ہے ۴۴

اب یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ درگاہ قلی کے زمانے سے سلام گوئی کو ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہو گئی تھی۔اگر چہ اس سے پہلے سلام گوئی کے نمونے ملتے ہیں،لیکن جستہ جستہ۔مسیح الزماں نے مسکین اور ان کے ہم عصروں کی مرثیہ گوئی کا ذکر

کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صلاؔح اوران کے معاصرین قربان علؔی ، خادم،کلیؔم
وغیرہ کے مرثیے بیشتر غزل کی صورت میں ہیں جن میں تسلسل
نہیں''۔۴۵؎

مسکیؔن کی پیدائش اور وفات کی تاریخ معلوم نہیں ۔ کسی تذکرہ نگار نے ان کی عمر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے ۔ چونکہ کربل کتھا کی تیاری کے وقت مرثیہ گو کی حیثیت سے ان کی شہرت مسلّم ہو چکی تھی ،اس بنا پر اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف اول کو ان کے عروج کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔۴۶؎

اس طرح مسکیؔن کے ہم عصر قربان علی ، خادؔم اور کلیؔم کا زمانہ بھی وہی مانا جائے گا جو کربل کتھا کی تیاری کا ہے۔ مسکیؔن اور سوؔدا کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی تھا۔ سوؔدا نے اپنے قصیدے شہر آشوب میں مسکیؔن کی مرثیہ گوئی کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے مسکیؔن کی مرثیہ گوئی کی اہمیت کے ساتھ مقبولیت اور شہرت کا پتہ چلتا ہے۔

علی جواد زیدی نے لکھا ہے کہ سلام گوئی کے ابتدائی نمونے محمد شاہ رنگیلے کے عہد حکومت سے پائے جاتے ہیں ۴۷؎۔ انھوں نے اس کی مثال میں مسکین کے سلام کے وہ شعر بھی نقل کیے ہیں جو گزشتہ صفحات میں نقل کیے جا چکے ہیں۔

ان ساری بحثوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۷۴۸ءتک سلام گوئی کی صنف کی با قاعدہ بنیاد پڑ چکی تھی اور یہ صنف بتدریج اپنی بنیادوں کو مستحکم کر رہی تھی ۔ ۱۷۵۳ءتک آتے آتے سلام گوئی کی صنف باضابطہ اپنا تشخص قائم کرنے میں بھی کامیاب ہوگئی ۔ ۱۷۵۳ء سے ۱۷۶۶ء کے درمیان درگاہ قلی ،سوؔدا ، فضلؔی ، میر تقی میؔر ، میر محمد تقی گھاسؔی ، ضاحکؔ اور مسکیؔن کے یہاں با قاعدہ سلاموں کے نمونے ملنے لگے۔

حوالہ (دوسرا باب)

۱۔ کاشف الحقائق ۔امداد امام آثر۔ص:۱۷۷

۲۔ المیزان ۔نظیر الحسن فوقؔ ۔ص:۴۸۵

۳۔ اردو مرثیے کی سرگذشت ۔اسداریب ۔ص:۱۶۲

۴۔ مطالعۂ ولیؔ (تنقید وانتخاب) شارب ردولوی ۔ص:۴۸ ۔سن اشاعت: جنوری ۱۹۷۲ء۔

۵۔ مطالعہ ولیؔ (تنقید وانتخاب) شارب ردولوی ۔ص:۴۹

۶۔ انیس کے سلام ۔علی جواد زیدی ۔س:۲۸

۷۔ انیسؔ کے سلام ۔علی جواد زیدی ۔ص:۲۹ ۔۲۸

۸۔ // // // // // //

۹۔ مرثیہ اور مرثیہ نگار ۔شارب ردولوی ۔ص:

۱۰۔ سلک سلام دبیرؔ ۔ص:۵۹ ۔۵۸

۱۱۔ سلک سلام دبیرؔ ۔ص:۵۸

۱۲۔ سلک سلام دبیرؔ ۔ص:۵۹

۱۳۔ اردو مرثیے کی سرگذشت ۔ص:۱۶۴

۱۴۔ انیس کے سلام ۔ص:۲۱

۱۵۔ انیس: شخصیت اور فن ۔ص:۳۷۷

۱۶۔ انیس: شخصیت اور فن ۔ص:۳۷۸

۱۷۔ انیس: شخصیت اور فن ۔ص:۳۷۶

۱۸۔ انیس کے سلام ۔ص:۲۱

۱۹۔ انیس: شخصیت اور فن ۔فضل امام ۔ص:۳۷۷، سلک سلام دبیرؔ ۔جلد دوم ۔ص:۵۸

۲۰ سلک سلام دبیر۔ جلد دوم۔ ص: ۵۸

۲۱ آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ ص: ۳۸۸

۲۲ انیس: شخصیت اور فن۔ ص: ۳۸۸

۲۳ اردو مرثیے کا ارتقا۔ مسیح الزماں۔ ص: ۷۲

۲۴ اردو مرثیے کا ارتقا۔ ص: ۷۲

۲۵ ولادت بیجاپور ۹۶۱ھ (۱۵۵۳ء) وفات: بیجاپور، ۱۵ یا ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۰۷ھ (نومبر ۱۵۹۹ء)

۲۶ اردو مرثیے کا ارتقا۔ ڈاکٹر محمد چراغ علی۔ ص۳۸۔۳۹ حیدرآباد ۱۹۷۳ء بحوالہ پروفیسر محمد حسن

۲۷ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ پروفیسر محمد حسن۔ ص۲۳۹، اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء

۲۸ ایضاً

۲۹ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ پروفیسر محمد حسن۔ ص: ۴۰۔۲۳۹ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء

۳۰ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ پروفیسر محمد حسن۔ ص: ۲۴۰ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء

۳۱ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ محمد حسن۔ ص: ۲۴۰ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء

۳۲ محمد نصرت (ملک الشعرائے ہند) وفات: بیجاپور، ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴۔۱۶۷۵ء) از: تذکرہ ماہ و سال۔ مالک رام۔ ص: ۳۹۰۔ بحوالہ دیوان نصرتی مرتبہ جمیل جالبی

۳۳ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ محمد حسن۔ ص: ۲۴۱۔۲۴۰ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء

۳۴ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ محمد حسن۔ ص: ۲۴۰

۳۵ تذکرہ ماہ و سال، مالک رام

۳۶ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ محمد حسن۔ ص: ۲۴۵

۳۷ اردو شاعری میں سلام غزل کا قائم مقام ہے۔ جس طرح غزل میں ہر شعر کا مضمون علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے اور تسلسل بیان سے مطلب نہیں رکھا جاتا حتی کہ دو شعروں کے مضمون میں بھی تسلسل نہیں پایا جاتا۔ ایک شعر میں زلف محبوب کی تعریف ہے تو دوسرے میں ہجر کے مصائب کا ذکر ہے، یہی سلام کا بھی حال ہے۔ (المیزان نظیر الحسن فوق۔ ص: ۴۸۵)

۳۸؎ اردو مرثیے کا ارتقا۔ مسیح الزماں۔ ص:۷۲۔۷۱۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۲ء

۳۹؎ ولادت:۱۷۰۲ء، تخت نشینی:۱۸ستمبر ۱۷۱۹ء وفات:۱۷۴۸ء۔ بہ حوالہ تذکرہ ماہ وسال۔ مالک رام

۴۰؎ انیس کے سلام۔ علی جواد زیدی۔ ص:۲۱۔ اردو مرثیہ۔ سفارش حسین۔ ص:۱۳۹

۴۱؎ اردو مرثیے کا ارتقا۔ مسیح الزماں۔ ص:۸۰

۴۲؎ اردو مرثیے کا ارتقا۔ مسیح الزماں۔ ص:۸۲

۴۳؎ عہد محمد شاہ رنگیلے

۴۴؎ اردو مرثیے کا ارتقا۔ مسیح الزماں۔ ص:۸۳

۴۵؎ اردو مرثیے کا ارتقا۔ مسیح الزماں۔ ص:۸۷

۴۶؎ اردو مرثیے کا ارتقا۔ مسیح الزماں۔ ص:۸۷

۴۷؎ انیس کے سلام۔ ص:۲۸

تیسرا باب

سلام گوئی کا ابتدائی دور

(الف) سلام گوئی کا ابتدائی دور (جنوبی ہند میں)

(ب) سلام گوئی کا ابتدائی دور (شمالی ہند میں)

اردو شاعری کے ابتدائی دور میں شاعری کی جو اصناف وجود میں آئیں ان میں کچھ عربی و فارسی سے مستعار تھیں اور کچھ اصناف[1] ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی فضا کی بدولت وجود میں آئیں۔ جبکہ رثائی اصناف ہندوستان، عرب اور ایران کے ملے جلے عناصر سے وجود میں آئیں۔

عربی شاعری میں کربلا کے واقعے کے تعلق سے مراثی یا رثائی اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ اس سلسلے کا بیشتر سرمایہ فارسی شاعری کے قالب میں ہی دستیاب ہے۔ لیکن اردو مرثیے نے اپنے مضامین و موضوعات کے عربی و فارسی سے مستعار ہونے کے باوجود ہندوستانی فضا، آب و ہوا، ماحول، تہذیب وتمدن، طرز معاشرت اور رسوم ورواج کو فطری انداز میں اس طرح اپنے اندر جذب کیا کہ وہ بعض مرتبہ خالص ہندوستانی صنف نظر آتا ہے۔ رثائی شاعری کے بطن سے جو اصناف وجود میں آئیں ان میں سے ایک صنف ''سلام'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

سلام کی صنف بہت سے نشیب وفراز اور سرد وگرم سے گذر کر دکن سے دہلی اور دہلی سے اودھ کی سرزمین تک پہنچی۔ اودھ پہنچ کر اس صنف نے ترقی کی ان منزلوں کو بھی طے کرلیا جہاں پر یہ صنف غزل جیسی مایہ ناز شاعری کے ہم پلہ اور ہم سر نظر آنے لگی۔

زیرنظر (تیسرے) باب میں دکن اور شمالی ہندوستان کے ان شعرا کا ذکر ہے جو منطقی دلائل اور تاریخی حقائق کی روشنی میں سلام گوئی کی ابتدا کے روح رواں تصور کیے جائیں گے۔

اب تک کی تحقیق سے یہ پتہ چلا ہے کہ دکن کا پہلا سلام گو شاعر ابوالقاسم مرزؔا ہے جس نے سلام کے عنوان سے شعر کہے۔ مرزؔا کے ہم عصر اور اس سے پہلے کے شعرا کے یہاں سلاموں سے ہیئتی اور موضوعاتی مناسبت رکھنے والے اشعار ملتے ہیں۔ لیکن ان شعرا کے یہاں ''سلام'' کے عنوان سے شعر کہے جانے کا ثبوت نہیں ملتا۔

سلام اور مرثیے کے انتخاب اور مجموعے مرتب کرنے والوں نے قلی قطب شاہ کے بعض مرثیوں کو سلام کے عنوان سے درج کیا ہے۔[2] لیکن قلی قطب شاہ کے کلیات میں کسی رثائی یا غیر رثائی شعر کے لئے سلام کا عنوان نہیں ہے۔ پھر بھی ہیئتی اور موضوعاتی ربط اور صنفی مناسبت کی موجودگی کے سبب قدیم مراثی کی ہیئت اور سلاموں کی ہیئت میں مطابقت اور مناسبت کو واضح

کرنے کے لئے اس باب میں قلی قطب شاہ قطبؔا، وجہیؔ اور غواصیؔ کے رثائی اشعار کے نمونے بھی مختصر تمہید اور تبصرے کے ساتھ شامل ہیں۔اس کے بعد سلام کی صنف میں با ضابطہ طبع آزمائی کرنے والے نمائندہ شعرا کا ذکر ہے۔ان شعرا میں درگاہ قلی خاں کا نام سب سے زیادہ اہم ہے۔ درگاؔہ کے خصوصی ذکر کے بغیر سلام گوئی کے ابتدائی دور کا باب نامکمل رہے گا۔ درگاؔہ جنوبی ہند کے سلام گویوں میں سب سے اہم، لائق اور باشعور شاعر ہے۔

درگاؔہ نے مفردہ اور مربع دونوں ہیئتوں میں سلام کہے ہیں۔لیکن ان کا مفردہ سلام ہی دستیاب ہوا ہے۔(جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا)مذکورہ سلام کی زبان،طرز اور اس کے ترقی یافتہ آہنگ سے ان کے دوراندیش ذہن اور اچھوتے طرزِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔

اس اعتبار سے ابتدائی دور میں جنوبی ہندوستان کے سلاموں اور سلام گویوں کے مجموعی ذکر واحتساب میں درگاؔہ کا قد اور شمالی ہندوستان میں مسکیںؔ، ضاحکؔ اور سوؔدا کا قد سب سے بلند اور منفردہ نظر آتا ہے۔

سلام گوئی کا ابتدائی دور

(جنوبی ہند میں)

سلطان محمد قلی قطب شاہ
جلوس: ۱۵۸۰ء
وفات: ۱۶۱۱ء۔۱۶۱۲ء

محمد قلی کا تخلص قطبا اور معانی دونوں تھا۔ محمد قلی تینز بانوں اردو، فارسی اور تلنگی میں شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے حیدر آباد شہر کی بنیاد ڈالی اور صاحبان علم وفن کو یہاں آکر بسنے کے مواقع فراہم کیے۔ محمد قلی کے عہد کے اردو شعرا میں ملا وجہی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔

اردو شاعری کی تاریخ قلی قطب شاہ کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ ابتدائی مرثیہ گوئی کے کارآمد نمونے انہیں کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ سلام گوئی کے تذکرے میں بھی قلی قطب شاہ کا ذکر اس طور پر ضروری ہے کہ سلاموں کی جو طے شدہ ہیئت آج ہمارے سامنے ہے وہی ہیئت قلی قطب شاہ کے مراثی کی ہے۔ ان کے مراثی کی ہیئت اور موضوعات بعد کے بیشتر سلاموں سے مطابقت رکھتے ہیں۔

آؤ مل کر ماتمیاں سب اس غماں نے لہو رووی
وا اماماں یا اماماں یاد کر کر دل کھووی

آہ ہمارے درد تے دریا کوں سب جوش آوتا
ماتمیاں کے لہو بونداں تے آگ سب بج جاوتا

سب دکھاں کوانت ہے اس دکھ کی تائیں انت نہیں
فاطمہؑ کے پوت بن اس جگت منے نہیں نور کہیں

فاطمہؑ دکھ تے عرش کرسی تے غم انجھو مٹے
ساتوں آسماں ہور زمیں میں آگ کی بھرکی اٹھے

دو جگ اماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن روں کی لکڑیا جال کر کرتے ہیں خواری وائے وائے

قطبا کسے دل کے بچن ، ہر دم مد دمن پنجتن
راکھے خدا منج کوجتن ، دشمن کوں خواری وائے وائے

مرزا
(قطب شاہی)
قطب عبداللہ کے درباری شاعر تھے۔

ابولقاسم مرزا کا شمار سلام کی صنف کے بانیوں میں کیا جائے گا۔ سلام کے ابتدائی نمونے ''سلام'' کے عنوان سے مرزا کے یہاں ہی پائے جاتے ہیں۔

مرزا، ابوالحسن تانا شاہ کے مصاحب تھے۔ تانا شاہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد مرزا فقیر ہو گئے اور بقیہ عمر حیدر آباد میں ہی گذاری اور وہیں انتقال کیا۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

اردو شاعری کا تقریباً چار سو سال قدیم نمونہ ہونے کے باوجود زبان بہت صاف اور رواں ہے ۔

اے حسینؓ علیؑ سلام علیک — شاہے جملہ ولی سلام علیک
جد ہے تیرا محمدؐ مرسل — سرورا نبیا سلام علیک
فاطمہؓ ہور علیؑ کے دریا کا — توں دُرِ بے بہا سلام علیک
سرور دیں حسنؓ کا توں بازو — اے دو جگ پیشوا سلام علیک
ہے ترے نام پر جنم مرزا — جان و دل سوں فدا سلام علیک ۵

اے شہ عالی مقام شاہ سلام علیک — ہر دو جہاں کے امام شاہ سلام علیک
مومن کے من تمام شاہ پہ بھیجو سلام — صدق سوں ہر دم مدام شاہ سلام علیک

اے شہ دیں شیر نرد ہرتوں کرم کی نظر　　لطف سوں مرزاا و پر شاہ سلام علیک ۶

وجہی

وفات: ۱۶۳۵ء

ملاً اسد اللہ وجہی بےکئی اعتبار سے قدیم دکنی ادب میں اپنی انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ اس بات پرفخر کرتے تھے کہ شعرا کی طرح وہ دوسروں کے مضامین پر انحصار نہیں کرتے بلکہ خود مضامین تخلیق کرتے ہیں۔ وجہی کی نثر اور نظم دونوں کا نمونہ ایک ادبی شاہکار کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ ۸

وجہی کے رثائی اشعار کی ادبی حیثیت کے بارے میں کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اشعار کے مطالعہ سے صرف اس زمانہ کی زبان اور رثائی شاعری کے طرز ورجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

وجہی کا مفردہ کی ہیئت میں ایک رثائی کلام ملتا ہے، جسے بیشتر محققین نے مرثیہ کے عنوان سے نقل کیا ہے۔ بعض نے ۹ موجودہ زمانے کے سلاموں کی ہیئت کے مطابق ہونے کے سبب سلام کے عنوان سے بھی نقل کیا ہے علی جواد زیدی نے ''العلم'' جریدے کے مرثیہ وسلام نمبر میں ذیل کے اشعار کو مراثی کے عنوان سے ہی نقل کیا ہے۔ ۱۰ محی الدین قادری زور کی ''اردو شہ پارے'' کے صفحہ ۹۵ پر وہ دس شعر مرثیہ کے عنوان سے اس طرح لکھے ہوئے ہیں۔

حسینؑ کا غم کرو عزیزاں　　انجو نین سوں جھڑو عزیزاں

بنا جو اوّل ہے.........غم کا　　عرش گگن، ہور، دھرت ہلایا

فضا میں جوں جوں لکھیا ابھی　　گریا حسینؑ پر ادھی سمایا

نبیّاں، ولیّاں کے انجواں سوں مکڑے　　یو غم حسینؑ کا جنم دھولایا

دلاں میں دو گگی چھوہ نے چٹکیاں　　یو غم نے سلگا ابرک لگایا

یو کیا بلا تھا یو کیا جفا تھا　　مگر قضا تھا سو حق دکھایا

محبّ دلاں کوں اجل کا ساقی　　پیالہ غم کے سو بھر پلایا

یو کیا اندیشہ اندیش کیتا　　فلک شہاں پر ستم خدایا

حسینؑ پو یاراں درود بھیجو　　کہ دین کا یو، دیوا جلایا

تمہارے وجہی کوں یا اماماں　　نہیں تمن بن یو اس کو سایا

غواصی

ولادت: معلوم نہیں ہوسکی۔

وفات: ۳۰_۱۶۳۱ء۱۰۴۰ھ

اگر چہ خیال بہت واضح طور پر ظاہر کیا جا چکا ہے کہ ابتدا میں مرثیہ اور سلام میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، نہ دونوں میں امتیاز کی تفہیم کے لئے کسی حد فاصل کی نشاندہی کی گئی تھی۔ جو ہیئت اور موضوعات سلام کی صنف کے وجود میں آنے کے بعد اس کے لئے مقرر کیے گئے، وہی ہیئت اور موضوعات ابتدائی دور میں مرثیوں کے ہوا کرتے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے غواصی کے مرثیہ کے اشعار کو صنف سلام کا نقش اول قرار دیا جا سکتا ہے۔ بطور نمونہ چند شعر پیش ہیں ۔

دستا نہیں کروں کیا او بیان کربلا کا　　پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا

آسماں تے خدایا جبرئیل اوتر کو آیا　　روتا او پر تے لایا فرمان کربلا کا

کہر بار کربلا میں کر شکر ہر بلا میں　　کیوں ہے کہ کربلا میں مہمان کربلا کا

دکھ سب ملک لئے ہیں ماتم زدے ہوئے ہیں　　رو رو دریا کیے ہیں آسمان کربلا کا

نعیم

ولادت: تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔
وفات: تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔

''یورپ میں دکنی مخطوطات'' میں نعیم کے مرثیے کے عنوان سے تین شعر لکھے ہوئے ہیں۔ کتاب میں نعیم کا پورا نام بھی نہیں ہے۔ نہ نعیم کے حالات زندگی اور کلام کے بارے میں کوئی تبصرہ ہے۔ ولادت اور وفات کا سن بھی نہیں ہے۔

اشعار کا رنگ اور طرز قدیم ہونے کے باوجود زبان صاف، سادہ، پُراثر اور آسان ہے۔ کتاب میں تینوں شعر مرثیے کے عنوان سے لکھے ہوئے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعیم کے زمانے میں سلام کسی بھی منزل میں متعارف نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ان اشعار کو سلام کے عنوان سے درج کرنے میں کسی تکلیف اور رکاوٹ کی گنجائش نہیں تھی۔

شہ کئیں صبا تو روز جد کوں سلام کہنا — بے دفن و بے کفن کا جا کر پیام کہنا

سر کاٹ ظالموں نے تن سے جدا کیا ہے — سر تو چلا سفر کوں تن کا مقام کہنا

تیرے نعیم دل میں ہے نقش بندگی کا — کہتا ہے دو کہہ سیں رو رو شہ کا غلام کہنا [1]

ندا

ولادت و وفات: کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی

اسپرنگر کے والے سے ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' میں ندا کا ذکر ہے۔ ندا کا طرز اور انداز بھی نعیم ہی کی طرح ہے۔ ندا کے بھی تین ہی شعر لکھے ہوئے ہیں جنھیں پوری طرح سلام کہا جاسکتا ہے۔

اولاً محبوب رب العالمین او پر سلام — اس حبیب اللہ ختم المرسلیں او پر سلام

خشک لب خستہ جگر تشنہ دہن مغموم جاں — سر بُریدہ کشتۂ شمشیر کیں او پر سلام

بعد ازاں کہہ اے ندا ہر روز و شب دل سے مدام — شاہ کے قبہ مبارک اور زمیں او پر سلام

سلطان عبداللہ قطب شاہ [۱۲]

ولادت: ۱۶۱۴ء

وفات: ۱۶۷۴ء

سلطان عبداللہ قطب شاہ کا تخلص قطب عبداللہ تھا۔ وہ ایک اچھے شاعر اور موسیقی کے ماہر تھے انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ قطب عبداللہ محمد قلی قطب شاہ کے نواسہ تھے۔ ۱۰۳۵ھ میں اپنے والد سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے۔ قطب عبداللہ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے ساتویں فرماں روا تھے۔ قطب عبداللہ نے اپنے نانا اور والد کی طرح اردو زبان کی سرپرستی کی ان کے دور کو ادب و شاعری کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ امیر علی جونپوری نے لکھا ہے کہ:

> ''اہلبیتؑ سے عقیدت کی وجہ سے قصیدے، منقبت اور سلام و مرثیے بھی کہے''۔ [۱۳]

قطب عبداللہ کے مرثیے بیان کے اعتبار سے منفرد اور زبان کے اعتبار سے بہت صاف ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں زبان کی تراش خراش سجاوٹ اور بناوٹ پر کافی محنت ہو رہی تھی۔ غواصیؔ، وجہیؔ اور مرزاؔ، قطب عبداللہ کے درباری شعرا تھے ان شعرا کا سارا رثائی کلام مرثیہ کے عنوان سے درج ہے۔ لیکن ''ارمان زینبؑ عزائے حسینؑ'' کتاب میں قطب عبداللہ کے مندرجہ ذیل کلام کو سلام کے عنوان سے نقل کیا گیا ہے:۔

علیؑ ھور فاطمہؑ کرتے ہیں دونوں آج زاری بھی ۔۔۔ حسنؑ اور حسینؑ کا دوکھ لے آیا جگ پو خواری بھی

حسینؑ جب چلے لڑنے سراں بہیں پر لگے پرنے ۔۔۔ شہیداں ہر طرف چرنے لگا یو دوکھ اپاری بھی

وصیت یو کیے جاتے، نکو روتم آپ بہانے ۔۔۔ نہیں تو پھر کو نیں آتے اجل آئی ہماری بھی

یتیماں کو سنبھالو ہور، تمر بھی سکھالو ہور ۔۔۔ بہت میراں سوں پالو ہور، رہیں گے یادگاری بھی

پرے گا غم تمن پر جب، مرا غم یاد کرنا تب ۔۔۔ یو دوکھ یاد آوے گا ہر کب، کرونیں اشک باری بھی

حسینؑ کا دوکھ دل منے آں لگا یک چت سوں دائم وہاں
کرے قطب عبداللہ سلطاں دوکنوسوں شہر یاری بھی

شاہ قلی خاں شاہیؔ [۱۴]

ولادت: معلوم نہیں ہوسکی۔
وفات: ۱۶۸۲ء

شاہیؔ حیدرآباد کے رہنے والے اور قطب شاہی لشکر کے ملازم تھے۔ رفتہ رفتہ ابوالحسن تاناشاہ کے مصاحب ہوگئے اور اس کی زمینوں میں غزلیں کہنے لگے ایک شعر جو تاناشاہ کی نظم کا ٹکڑا سمجھا جاتا ہے۔ بعض تذکروں میں شاہی کے نام سے درج ہے۔

ملنا تمن کا غیر سوں کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کتے
کس کس کا موں موندوں سجن کوئی کچہ کتے کوئی کچہ کتے

اورنگ زیب کے فوجیوں نے جب حیدرآباد فتح کیا تو شاہیؔ لاپتہ ہوگیا۔ شاہیؔ کے اشعار کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ حیدرآباد کے باشندوں کو اس کے اشعار زبانی یاد تھے۔ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے بھی اس کے اشعار زبانی یاد کر لیے اور بطور سوغات شمالی ہندوستان لے آئے۔ تذکرۂ میر حسن اور تذکرہ سخن شعرا میں اس کا ذکر موجود ہے۔ شاہیؔ اپنے دور کا بہترین مرثیہ گو تھا۔ اس کے مرثیے آج بھی دستیاب ہیں۔

شاہیؔ کے مرثیے منفردہ کی ہیئت میں ہونے کے سبب سلاموں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

سلام گوئی کے ارتقائی سفر کے حوالے سے شاہیؔ کا ذکر ضروری ہے۔ کیونکہ سلام گوئی کے ابتدائی خدوخال اسی زمانے میں تراشے گئے تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہیؔ کے مرثیوں کے کئی پہلو اجاگر کیے ہیں۔ یہ پہلو ان مرثیوں کو سلاموں کے قریب لے جاتے ہیں:

''ان مرثیوں کے سلسلے میں دل چسپ بات یہ ہے کہ زیادہ تر

گانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس لئے ان میں غنائی رنگ گہرا ہے۔شاہی نے اپنے مرثیے مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق تحریر کیے ہیں اور ہر مرثیہ کے ساتھ ان راگ راگنیوں کے نام دیئے ہیں جن میں ان کو پڑھ کر سنایا جانا چاہئے۔ان مرثیوں میں غنائی رنگ غالب ہے۔موضوع کے اعتبار سے انھیں مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔لیکن مزاج و ہیئت کے اعتبار سے یہ گیت کے ذیل میں آتے ہیں''۔[۱۵]

اے غریب امامے عابد تیری زاری ہے
باپ کا مرنا دکھ کا بھرنا تس پر یو بیماری ہے
تیغ کھڑی لے دشمن سر پر واویلا دکھ بھاری ہے
درد، مصیبت عابدتم پر آج کے دن بسیاری ہے [۱۶]

درگاہ [۱۷]

ولادت:۱۷۰۸ء
وفات:۱۷۶۶ء

درگاہ قلی خاں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مرثیے کہے جو کئی ہیئتوں میں ملتے ہیں۔مسیح الزماں نے ان کی سلام گوئی کے بارے میں لکھا ہے :

''سر سالار جنگ کے کتب خانے میں ان کے انیس مرثیے اور اکیس سلام ہیں۔ سلاموں میں ....دس مربع کی شکل میں ہیں ''۔[۱۸]

درگاہ کی زبان بہت ترقی یافتہ اور عام فہم ہے۔الفاظ کا استعمال بے تکلف شستہ،شائستہ اور برمحل ہے۔ترکیبوں،استعارات اور محاورات کا محل استعمال نہایت موزوں اور مناسب ہونے کی وجہ سے اشعار کی لے مترنم ہوتی جاتی ہے،جس سے قاری کی دل چسپی بڑھتی جاتی ہے۔

درگاؔہ کے دور کے سلام کی صنف کو ایک معیار حاصل ہوا۔نمونہ کے طور پر ایک سلام نقل کیا جاتا ہے جس میں جناب رسول خداؐ، جناب فاطمہ زہراؑ اور بارہ اماموں کا جامعیت کے ساتھ سلسلہ وار ذکر ہے۔

ادب سے فاتحہ پڑھ کر کہو نبیؐ پہ سلام — نبیؐ کے قوت بازو علیؑ ولی پہ سلام
جناب اقدس خاتون حشر پر صلوات — شہید جرعہ زہر ہلا ہلی پہ سلام
لڑے ہیں جا کے ہزاروں سے با تن تنہا — شہ سریر شجاعت مہابلی پہ سلام
یتیم و بیکس و مظلوم عابدؑ و سجادؑ — وہ نور چشم و جگر گوشہ علیؑ پہ سلام
محیط علم لدنی محمدؑ باقر — پناہ روز قیامت کی کھلبلی پہ سلام
امام جعفر صادقؑ منور ملت — شجاع آئینہ دین صیقلی پہ سلام
امام موسی کاظمؑ قسیم نار و نعیم — بہار نادعلیؑ و سینجلی پہ سلام
امام ثامن ضامن کل ریاض رضا — شہ سریر ریاضت زکی رضی پہ سلام
امیر ملک سخاوت شہ جواد و کریم — تقیؑ و متقی و مہدی ذکی پہ سلام
گل حدیقہ احساں امام ہر دو جہاں — بہار باغ ولایت علیؑ نقیؑ پہ سلام
حسام لشکر و صمصام خوں فشان مصاف — هژ بر بیشۂ اسلام عسکری پہ سلام

ادب سے بندہ درگاؔہ بھیجتا ہے مدام
جناب اقدس اثنا عشر ولی پہ سلام [19]

ہاشم علی

ولادت: تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔
وفات: تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔

درگاہ قلی اور ہاشم علی برہانپوری کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ ہاشم علی نے ساری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور تمام مراثی کو ردیف وار جمع کر کے مجموعہ کا نام ''دیوان حسینی'' رکھا۔

جس کا قلمی نسخہ اڈنبرا کے کتب خانہ میں موجود ہے (نسخہ: ۳۷۹)
مسیح الزماں نے لکھا ہے کہ اس نسخہ کی مائکروفلم پر ہمارے ان بیانات کا دارومدار ہے۔[۲۰]
دیوان حسینی میں زیادہ تر مرثیے غزل کی ہیئت میں ہیں سلاموں کی تعداد بھی کافی ہے۔[۲۱]
کسی سلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا۔

ناؔجی

ولادت: ۱۲۵۶ھ تقریباً ۱۸۳۷ء
وفات: ۱۳۳۰ھ

نام سید اصغر حسین تھا۔ تاریخ گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ مرثیے، سلام اور نوحے بھی کہتے تھے۔ ناؔجی کے کلام میں واقعہ نگاری کے ساتھ روانی اور بے ساختگی ہے۔ ان کے نوحوں کے مجموعہ کا نام ''درۃ الغموم'' ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً دو ہزار تین سو اشعار ہیں۔
ان کی تاریخ وفات کو ہر سال ان کے نواسے میر سخاوت علی مجیؔد ان کی یاد میں طرحی محفل مسالمہ منعقد کیا کرتے تھے۔

ناؔجی کا سلام، سلام گوئی کے جملہ اوصاف اور شعری حسن سے آراستہ ہے۔

اے یارو کیسی چل گئی صرصر چمن چمن — لوٹا گیا ریاض پیمبرؐ چمن چمن
ہر عندلیب پٹتی ہے سر چمن چمن — برپا ہے ماتم گل حیدر چمن چمن
بہلاتی تھی بہشت میں اصغر کو یوں بتول — پھرتی ہوں تم کو گود میں لے کر چمن چمن
بھوکے ہو تین روز کے پیتے نہیں ہو کیوں — جاری ہیں نہریں دودھ کی اصغر چمن چمن
دادی سے گر خفا ہو تو دادا کے پاس جاؤ — لے کر پھریں گے ساقی کوثر چمن چمن

سلامی رن میں بے جاں ہو گیا تشنہ دہن دولہا
بنا تھا نام کو دنیا میں فرزند حسن دولہا

عجب شادی ہوئی زہرا و حیدر کے گھرانے میں
دلہن تھی بے ردا بلوے میں رن میں بے کفن دولہا
یہ وہ دولہا دلہن ہیں حال ان کا سن کے اے ناجیؔ
رہیں گے صرف شیون حشر تک سارے دلہن دولہا ۲۲

آصفؔ ۲۳

ولادت: ۱۸۶۶ء
وفات: ۱۹۱۱ء

میر محبوب علی آصفؔ غزل کے شاعر تھے۔ چونکہ سلام اور مرثیے دکن کی شاعری کا جز سمجھے جاتے تھے، لہذا روایت کی پاسداری کرتے ہوئے آصفؔ نے بھی ان اصناف میں طبع آزمائی۔

آصفؔ پہلے حکمراں تھے جنھوں نے اردو کو مملکت آصفیہ کی سرکاری زبان قرار دیا۔

نمونہ کے طور پر سلام کے چند شعر پیش ہیں۔ یہ سلام سلاموں کی ترقی یافتہ شکل کا نمائندہ ہے۔ سلام کی ابتدا مجرا، مجرائی اور سلام، سلامی کی روایتی پابندیوں سے آزاد ہے۔ لیکن مضمون خالص رثائی ہے۔ زبان کی روانی اور صفائی قابل تعریف ہے۔

سوئے مقتل جو شہ تشنہ جگر آتے ہیں — لشکر جن و ملک پیٹتے سر آتے ہیں
شاید اب ماتم سرور کا زمانہ ہے قریب — جگر و دل مرے بے تاب نظر آتے ہیں
ہائے کیا نام ہے شبیرؑ کا اے صلِ علیٰ — دردمندوں کے دل اس نام سے بھر آتے ہیں
خون دل نے مرے آشکوں کی بدل دی صورت — پہلے کچھ اور تھے اب اور نظر آتے ہیں
شرکت محفل ماتم کوئی آسان نہیں — لوگ تھامے ہوئے ہاتھوں سے جگر آتے ہیں
دل میں ہو داغ محبت تو ملے دل کی مراد — پھول کے بعد درختوں میں ثمر آتے ہیں
کیا تصور میں ہے قوت کہ جگر بند رسولؐ — بن کے تصویر مرے دل میں اُتر آتے ہیں

کیا تماشہ ہے ترستی ہے نظر جن کے لئے

جلوہ افروز وہی دل میں نظر آتے ہیں[۲۴]

مسرورؔ

ولادت ووفات:: کا سن معلوم نہیں۔

محی الدین قادری زورؔ نے لکھا ہے کہ میر محمد علی مسرورؔ کو مشرقی علوم میں تبحر حاصل تھا۔ اردو، فارسی اور عربی میں کئی مرثیے اور مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن انقلاب زمانہ نے چند اردو نوحے چھوڑے ہیں جن سے ان کی شعری استعداد کا پتہ چلتا ہے۔

چودہ سال کی عمر سے شعر گوئی شروع کی اور سب سے پہلے ایک سلام کہا اور اسی صنف کی طرف ان کا رجحان رہا۔

زورؔ کے مطابق ''ان کے سلاموں کا رنگ وہی ہے جو دراصل ہونا چاہیے''۔

سلام نہ بالکل نعت ومنقبت کے انداز میں ہیں نہ نوحے کی صورت میں مسرورؔ کے سلاموں میں مدح اور واقعات شہادت دونوں کے بیانات یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ دو سلاموں کے چند شعر بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

جز ولائے حق مرے دل میں کسی کی جا نہیں
کچھ دنوں جس میں رہے ہوں بت یہ وہ کعبہ نہیں

داغ جلتے ہیں جو دل کے منہ سے کیوں نکلے گی آہ
گلخن خورشید سے ہرگز دھواں اٹھتا نہیں

بند ہیں آنکھیں تصور میں مزے ہیں دید کے
چاند زہرا کا نگاہوں سے کبھی ہٹتا نہیں

چاہیئے رونا بھی شہؑ پر مدحت حیدرؑ کے ساتھ
لطف ہے گر گلفشانی میں دُرافشانی بھی ہو

عشق ہو ہاں عشق کس کا یوسف زہرا کا عشق

چاکدامانی سے ظاہر پاکدامانی بھی ہو

زیرِ خنجر کہتے تھے شہ نذر سر کو کر چکا

پردہ پوش عاصیاں لاشہ کی عریانی بھی ہو

کہتے تھے شہ کس طرح اکبر رضا مرنے کی دوں

رشکِ یوسف بھی جواں بھی احمدِ ثانی بھی ہو

جان دے تم پر نہ کیوں مسرورؔ اے پیارے حسینؑ

جانِ زہراؑ ہو حبیبِ حق کے تم جانی بھی ہو ۲۵

حوالہ (تیسرا باب)

سلام گوئی کا ابتدائی دور (جنوبی ہند میں)

۱۔ بارہ ماسہ، بسنت، لوک گیت، ریختی، ہزل، بابل (ڈولی) دوہا، معمّا ماخوذ از (۱) ''اصناف سخن اور شعری ہیئتیں''، شمیم احمد (۲) ''اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے'' عنوان چشتی (۳) ''اردو شاعری کا مزاج'' وزیر آغا (۴) ''آئینۂ بلاغت'' مرزا محمد عسکری۔

۲۔ ارمان زینب عزائے حسینؑ بنگلور (کرناٹک)

۳۔ ارمان زینب عزائے حسینؑ بنگلور (کرناٹک)

۴۔ مرزاؔ تخلص کے دو شاعر گذرے ہیں ایک کا تعلق عادل شاہی سلطنت سے تھا اور دوسرے کا تعلق قطب شاہی سلطنت سے۔ مندرجہ بالا ذکر قطب شاہی مرزاؔ کا ہے۔ اگرچہ عادل شاہی مرزاؔ کے سلام کا نمونہ دستیاب نہیں۔ لیکن اس بات کا ذکر اس لئے ضروری ہوا کہ قطب شاہی اور عادل شاہی مرزاؔ کی شناخت میں آسانی ہو۔ دیگر دکنی مرثیوں کی طرح عادل شاہی مرزاؔ کے مرثیے بھی اڈنبرا کی بیاض میں موجود ہیں۔

عادل شاہی مرزاؔ نے سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ نویسی کا ایسا شوق تھا کہ انتقال کے وقت بھی ایک مرثیہ کا عنوان لکھ رہا تھا۔ بادشاہ سے قربت تھی۔ لیکن کبھی بادشاہ کی شانِ میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ بادشاہ نے خود اس کی خواہش ظاہر کی جس کے جواب میں مرزاؔ نے ایک مرثیہ میں بجائے اپنے تخلص کے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔ مرزا مرثیہ گوئی کو ایک مذہبی فریضہ تصور کرتا تھا۔ اسی انہماک کا نتیجہ تھا کہ اس کو خواب میں بھی اس کی تلقین ہوتی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مرزاؔ (عادل شاہی) اپنا مرثیہ سنا رہا تھا۔ ع

دلاں پا کہاں اناراں کر کہو سینہ طبق میانے

دوسرے مصرع کے لئے مضمون نہیں مل رہا تھا۔ اسی اثنا میں مرزؔا پر مدہوشی طاری ہوئی۔ دیکھا کہ آنحضرت صلعم تشریف فرما ہیں اور ارشاد ہوتا ہے۔

بنی روبنے محشر کوں یو تحفہ کرلے جانا ہے۔

مرزؔا نے اس کو کہہ کر مرثیہ پورا کیا۔ (بساتین السلاطین۔ برٹش میوزیم۔ ص:۹۲)

۵۔ سلک سلام دبیر۔ تقی عابدی۔ ص:۵۹۔۵۸

۶۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ نصیرالدین ہاشمی۔ ص:۱۹۲

۷۔ سفارش حسین نے اپنی کتاب اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ) میں وجہی کا نام وجہہ الدین لکھا ہے۔ ص:۳۵

۸۔ (i) قطب مشتری (۱۰۱۸ھ۔۱۶۰۹ء) (ii) سب رس (۱۰۴۵ھ۔۱۶۳۵ء)

۹۔ (i) ارمان زینب عزائے حسینؑ (ii) تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ امیر علی جونپوری

۱۰۔ العلم (دوماہی) بمبئی: جون۔۱۹۹۳ء۔ ص:۲۰۷

۱۱۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ ص:۲۸۰

۱۲۔ تلخیص از داستان ادب حیدرآباد۔ زورؔ۔ ص:۳۰

۱۳۔ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ ص:۴۹۷

۱۴۔ سلطان علی عادل شاہ والی بیجاپور کا تخلص بھی شاہیؔ تھا۔

۱۵۔ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص:۱۹۶

۱۶۔ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ امیر علی جونپوری

۱۷۔ درگاہ قلی خاں حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ ''مرقع دہلی'' ان کی مشہور تصنیف ہے، جس میں مرثیہ گویوں اور مرثیہ خوانوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے۔ ۱۷۳۸ء میں درگاہ دلی پہنچے اس وقت ان کی عمر تیس سال تھی۔

۱۸۔ اردو مرثیے کا ارتقا۔ ص:۲۷

۱۹ مرقع سخن ۔ص:۳۶ (از میر سعادت علی رضوی) مدیر عمومی: ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ ۔
مطبوعہ: اعظم اسٹیم پریس ۔ چار مینار، حیدرآباد دکن ۔۱۹۳۵ء

۲۰ اردو مرثیے کا ارتقا۔ص: ۶۵

۲۱ اردو مرثیے کا ارتقا۔ص: ۷۰

۲۲ مرقع سخن ۔ص: ۲۲۳۔ مدیر عمومی سید محی الدین قادری زورؔ ۔ اعظم اسٹیم پریس، چار مینار
حیدرآباد ۱۹۳۵ء

۲۳ وفیات مشاہیر اردو ۔ص: ۱۱۷

۲۴ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو ۔ص: ۱۰۵

۲۵ مرقع سخن ۔ص: ۳۱۲۔۳۱۱، مدیر عمومی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ۔ مطبوعہ، اعظم
اسٹیم پریس ۔ چار مینار، حیدرآباد دکن ۔۱۹۳۵ء

سلام گوئی کا ابتدائی دور
(شمالی ہند میں)

تیسرے باب کے دوسرے حصّہ میں شمالی ہندوستان کے جن شعرا کا ذکر ہے ان میں سے بیشتر کا تعلق دلّی سے ہے۔ان میں سے کچھ شعرا ایسے ہیں جو دلّی کے اجڑنے کے بعد اودھ آ گئے تھے۔اس طرح انھیں دونوں خطوں کی نمائندگی اور فیض یابی و فیض رسانی کا شرف حاصل ہے۔

جن شعرا نے دلّی اور اودھ دونوں مقامات پر علم و ادب کی شمع روشن کی ان میں نمایاں نام ضاحکؔ، سوداؔ، میر تقی میرؔ اور میر حسن کے ہیں۔لیکن چونکہ ان کی شناخت دہلوی شعرا کی حیثیت سے ہی قائم ہے اس لئے انھیں شمالی ہندوستان کے دہلوی شعرا کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

مسکین [1]

ولادت ووفات: تاریخ معلوم نہیں ہوسکی

میر عبداللہ مسکین کا ذکر بہت کم تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ کچھ جگہوں پر مسکین کا نام محمد مہدی بھی ملتا ہے۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد کے خالص مرثیہ گو شاعر تھے۔ ان کے دو اور بھائی حزین اور غمگین بھی مرثیہ گوئی میں شہرت رکھتے تھے۔ لیکن مسکین کے علاوہ کسی کا نمونۂ کلام دستیاب نہیں۔ یہ مسکین وہی میاں مسکین ہیں جن کا ذکر سودا نے اپنے قصیدے میں کیا ہے۔ نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ نے اپنے دہلی کے سفر کی جو روداد "مرقع دہلی" کے عنوان سے تحریر کی ہے اس میں ان تینوں بھائیوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

امیر علی جونپوری نے لکھا ہے کہ مسکین کے چند مرثیے اور سلاموں کی بیاض برٹش میوزیم پنجابی ہندولف مخطوطات ۹ ۳۹ بلوم ہارٹ ۱۸۹۹ء میں محفوظ ہے۔

مسکین کے سلام کا نمونہ یہ ہے۔

اے مدینے کے ستارے السّلام
کربلا کے سرا تارے السّلام

یا شاہ جتے تن ہیں تمہیں کرتے ہیں سلام — کیا روح کیا بدن ہیں تمہیں کرتے ہیں سلام

یکرو

وفات: ۱۱۶۵ھ یا اس سے کچھ پہلے تقریباً: ۱۷۵۲ء

یکرو[1] کا نام عبدالوہاب تھا۔ آبرو کے شاگرد تھے[2]۔ نکات الشعرا کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر ان سے ذاتی طور پر واقف تھے، اور انھیں دو تین مرتبہ مشاعروں میں دیکھا تھا۔

یکرؔو کا رثائی کلام قدیم طرز کی منفردہ کی ہیئت میں ہے اور نوحہ کے عنوان سے ان کے دیوان میں موجود ہے۔ انھیں نوحوں میں سے ایک نوحہ کو علی جواد زیدی نے ''العلم'' کے مرثیہ وسلام نمبر میں ''سلام'' کے عنوان سے درج کیا ہے۔

چونکہ یہ کلام اس دور کی تخلیق ہے جب رثائی شاعری اپنی ابتدائی منزل میں تھی اور رثائی اصناف کی واضح درجہ بندی نہیں ہوئی تھی۔ مگر چونکہ ان کے دیوان میں نوحہ کا عنوان موجود ہے۔ لہٰذا اس کلام کو نوحہ ہی تصور کیا جائے گا۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں سلام کی صنف با قاعدہ موجود نہیں تھی۔ لہٰذا سلام کی صنف کے تقاضوں سے مطابقت رکھنے کے سبب سلام کی صنف کا اولین نقش بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔

گل رنگ پیرہن کوں شہادت میں کر گئے — لالہ جیوں داغ دل پہ محباں کے دھر گئے
روتے ہیں اہلبیتؑ ایتا شہ کے درد سیں — انجھواں ستی نین کے ندی نالے بھر گئے
ایتے بہائے خون کے یم شہ نیں رن منیں — دشمن کے سر کدو کے نمن جل میں تر گئے
دستا ہے ست جگت تو اندھیارا نہیں ہے جوت — وے مہر و ماہ دین کے دونوں کدھر گئے
سن کر محبت آل کی یکرؔو شہاں کی بات — بسمل جیوں بے قرار پھڑک کر کے مر گئے

یکرؔو کے عہد کے آس پاس دبستان دہلی کی بنیاد پڑی اور شمالی ہندوستان میں شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس عہد کے بعد ہی اردو شاعری کو ہندوستان گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور میرؔ و سوداؔ اور دردؔ جیسے تاریخ اور ادب ساز شعرا کے لئے زمین ہموار ہوئی۔[۳]

ضاحکؔ

ولادت: دلی۔ ۱۷۰۶ء۔ ۱۷۰۷ء

ضاحکؔ کا نام غلام حسین تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی زبان صاف، شستہ

وفات: فیض آباد۔۱۷۸۲ء اور رواں ہے۔ ضاحکؔ کا تعلق دلّی کے اس زمانے سے ہے جب اردو کو صاف اور عام فہم بنانے کے لئے محمد شاہ رنگیلے کے امیر الامرا عمدۃ الملک محمد امیر خاں نے ایک دفتر قائم کیا تھا۔ جہاں الفاظ تراش خراش کے بعد والیان ریاست کو بھیجے جاتے تھے تاکہ وہ انھیں اپنے زیر اقتدار علاقوں میں رائج کریں۔ محمد امیر کے قتل کے بعد یہ دفتر والی اودھ کی کوششوں سے فیض آباد منتقل ہوا۔ اس دفتر میں ضاحکؔ کو ایک خاص منصب پر مقرر کیا گیا۔[۹]

ضاحکؔ کا بیشتر کلام نایاب ہے۔ ضاحکؔ میر تقی میرؔ، سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ کے ہم عصر تھے۔ عموماً ماہ محرم میں ثواباً مرثیہ وسلام کہتے تھے اور ان میں ضاحکؔ کے بجائے غلام حسین تخلص نظم کرتے تھے۔ محمد عباس آصفؔ نے لکھا ہے کہ ضاحکؔ کو فن موسیقی میں دخل تھا۔ اس کا عکس ان کے اشعار میں بھی نظر آتا ہے۔ سلام کے چند اشعار بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں ۔

اے شہ عالی نسب تم پہ صلوٰۃ وسلام — خسروِ والا حسب تم پہ صلوٰۃ وسلام

شرق سے لے تا بہ غرب اور جنوب وشمال — بھیجیں عجم اور عرب تم پہ صلوٰۃ وسلام

مالک ملک عرب والی مصر و حلب — ترک وحبش بولیں سب تم پہ صلوٰۃ وسلام

دل سے سدا یہ غلامؔ تم کو کہے ہے مدام — بھیجے ہے ہر روز وشب تم پہ صلوٰۃ وسلام

سلام کے یہ اشعار اس دور کی مثال اور نمونہ ہیں جب یہ صنف اپنے ابتدائی خدوخال طے کر رہی تھی۔ مذکورہ بالا سلام کی منفردہ کی ہیئت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کلام اپنے ابتدائی دور کے بعد کا نمونہ ہے۔ کیونکہ بالکل ابتدا میں منفردہ کی ہیئت سلاموں کے لئے مخصوص نہیں ہوئی تھی۔ اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ انھیں کے ہم عصر مرزا محمد رفیع سوداؔ کے یہاں مربع کی ہیئت میں سلام موجود ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ضاحکؔ نے آنے والے زمانہ کے مزاج اور رجحان کو پہچان لیا تھا یا وقت اور حالات نے خود کو ضاحکؔ کی مرضی اور رجحان کے مطابق ڈھال لیا، اور سلاموں کے لئے منفردہ کی ہیئت

مخصوص کرلی۔

ضاحکؔ کے سلام کی بڑی خوبی بحروں میں روانی کے ساتھ ماتمی لے اورعزائی عنصر کی فطری آمیزش ہے۔مندرجہ ذیل سلام کی ترکیب ملاحظہ ہو۔

کربلا کے قتیل تم پہ سلام ! ‏ ‏ ‏ راہ حق کی دلیل تم پہ سلام !

تشنۂ دشت کربلا تم ہو ! ‏ ‏ ‏ ساقی سلسبیل تم پہ سلام !

تین دن تشنہ رہ کے تم نے کیا ‏ ‏ ‏ خون اپنا سبیل تم پہ سلام

صبر ایوبؑ تم سے اخذ کیا ‏ ‏ ‏ یہ ہے صبر جمیل تم پہ سلام

عرض کرتا ہے یہ غلام حسینؑ ‏ ‏ ‏ ہو نہ ہرگز ذلیل تم پہ سلام

****

سوداؔ

ولادت:۱۷۰۶ء-۱۷۰۷ء

وفات: ۱۷۸۱ء

مرزا محمد رفیع سوداؔ قصیدہ گوئی کے لئے مشہور ہیں۔ہجو گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔غزلوں کے علاوہ مرثیوں اور سلاموں کا معیاری ذخیرہ ان کے کلیات میں موجود ہے۔

سوداؔ نے اپنے ہم عصر میر محمد تقی گھاسی تقیؔ کے سلام اور مرثیے پر منظوم تنقید کر کے سلام کی صنف میں تنقید کی باقاعدہ بنیاد ڈالی۔سلام کی صنف کو ادب کے معیار پر لانے میں سوداؔ کا کلیدی حصّہ ہے۔انھوں سلام گوئی کو جس مرتبے پر پہنچایا اس دور میں اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔سوداؔ کے کلیات میں کل بارہ سلام ہیں، جن میں نو مفردہ کی شکل میں ہیں اور تین مربع کی شکل میں ہیں۔

نبیؐ کے نور بصر پر کہو درود و سلام ‏ ‏ ‏ علیؑ کے لخت جگر پر کہو درود و سلام

کہے ہے عرش کے سکان سے سدا جبریل ‏ ‏ ‏ امام جن و بشر پر کہو درود و سلام

سوداؔ کے زمانے تک سلام کے موضوعات بہت محدود تھے۔ کچھ مخصوص موضوعات کے ذکر کو ہی سلام گوئی کا مقصد سمجھا جاتا تھا۔

تجھ پہ رورو جب کہے ابر سیہ پوش السّلام　　بولے اس کے ساتھ برق شعلہ بردوش السّلام

ادب سے بھیجے ہے تجھ کوترا غلام سلام　　قبول ہوتری خدمت میں یا امام سلام

میر محمد تقی گھاسی

ولادت ووفات: کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی

میر محمد تقی گھاسی کا تخلص تقی تھا۔ سوداؔ کے ہم عصر خالص مرثیہ گوشاعر تھے۔ یہ وہی میر تقیؔ ہیں جن کے ایک سلام اور ایک مرثیہ پر سوداؔ نے منظوم تنقید کی ہے۔ یہ تنقید نثری مقدمہ کے ساتھ سوداؔ کے کلیات میں ''سبیل ہدایت'' کے عنوان سے موجود ہے۔

سوداؔ کے خیال میں تقیؔ کے سلام سے خدا اور رسولؐ کی توہین ہوتی ہے۔ سلام یہاں نقل کیا جاتا ہے:

اے نبیؐ کے باطناً رتبے کے والی السلام　　ظاہراً ان سے بھی ہو اک نوع عالی السلام

اے تصدق یہ پدر یہ مادر اور یہ جد پاک　　ختم ہے تم پر یہ سب صاحب کمالی السلام

لا مکاں بھی ایک بازیگاہ طفلی ہے ترا　　کوئی مکاں تم سے نہیں پاتا میں خالی السلام

ہے گریباں گیر گردوں تیرے لشکر کا لہو　　تا قیامت کم نہیں ہوتی ہے لالی السلام

اے ہوالاوّل ہوالآخر کے مالک بالیقیں　　وے ہوالظاہر ہوالباطن کے والی السلام

یہ شہادت تیری تائید انا بشر کی تھی　　کیا حدیث مثلکم تم نے نبھالی السلام

یہ شہادت تیرے کلمے کی شہادت ہے تمام　　عبد ہو کے بات تو نے ساری پالی السلام

ورنہ تم بے شبہ و شک احمد بے میم ہو لی مع اللہ کے ہو تم ہر وقت حالی السلام

آفتاب

ولادت:۱۷۱۸ء [۵]

وفات:۱۸۰۶ء

''العلم'' جریدے کے مرثیہ وسلام نمبر میں [۶] ''شاہی نذرانہ عقیدت'' کے عنوان سے شاہ عالم ثانی آفتاب کا ایک سلام درج ہے۔ عام بول چال کی زبان میں یہ سلام مغلیہ عہد کے آخری زمانہ کی زبان و تہذیب کا ایک عمدہ مرقع ہے۔

مذکورہ سلام میں ہندوی یا ہندوستانی زبان کی مکمل جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

کہتی تھی سکینہ بھائی پیارے، تیر کے مارے لیجو سلام
اماں جائے رو دادھاری مرن ہارے لیجو سلام

آئی بہنا تیری سکینہ! اٹھو بلا لوں بات کرو
ہائے پڑے ہو خاک کے اوپر، موت بسارے لیجو سلام

کرتا شلُو کا خاک بھرا ہے زلفیں لہو میں ڈوب رہیں
نبیؐ علیؑ کے اصغرؑ پیارے، راج دلارے لیجو سلام

ہنکاری دے تو میری خاطر، گود میں آ تو میری ذرا
آنکھ نہ کھولے، منہ سے نہ بولے، بھولے بچارے لیجو سلام

شمس و قمر، زہرہ و عطارد، مشتری اور مریخ، زحل
رو رو پکارے ہائے سما پر سارے ستارے لیجو سلام

میں تو تمہارے در کا بھکاری مہر سے اس پر کرنا نظر
کہتا ہے تم سے شاہِ عالم پیر ہمارے لیجو سلام

میر

میر تقی میرؔ کی شاعری کی اپنی ایک امتیازی شان

ولادت: ۲۳-۱۷۲۴ء

وفات: ۱۸۱۰ء

اور انفرادی شناخت ہے۔ آنکھوں کو نم کر دینے والی غزلیہ شاعری میرؔ کے یہاں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگر چہ میرؔ کے مرثیے اور سلاموں میں حزن وملال کی وہ کیفیت اور تاثیر نہیں جو ان کی غزلوں کی انفرادیت اور امتیاز ہے۔لیکن اُس دور کی سلام گوئی کے فن کے معیار کے پیش نظر دیکھا جائے تو ان سلاموں کی ادبی اہمیت مسلم نظر آتی ہے ۔

اے بدخشان نبیؐ کے لعل احمر السلام — وے گلستان علیؑ کے لالۂ تر السلام

ایک ساعت ہی میں امت پھر گئی نانا کی سب — کیا قیامت لائی تیرے سر کے اوپر السلام

بوند بھر پانی نہ دریا پر تجھے پینے دیا — اے تمنائے دل ساقی کوثر السلام

سب کنارے لگ گئے تو بحرِخوں میں غرق ہے — اے کنار مصطفٰی کے ناز پرور السلام

تو تو شاہ دیں تھا ایسا ہو کے بے کس کیوں ہوا — اب نہ تن پر سر ہے نہ سر پر ہے افسر السلام

بات کو بے پردہ کہیے کس طرح اب ہائے ہائے — ہیں حرم کے لوگ اب محتاج چادر السلام

کیا ستم کشیاں بیاں تیری کرے دل خستہ میرؔ
نام تیرا سن کے آنکھیں ہوتی ہیں تر السلام

شیخ چاند نے میرؔ کے مربع سلام کا ایک بند نقل کیا ہے۔

درویش بے بضاعت ہے میرؔ دست کوتہ — غیر از سلام تحفہ رکھتا نہیں ہے کچھ وہ

ہر لحظہ اور ہر دم، ہر گاہ اور بے گہہ — اے شاہ دوسرا کے تجھ کو سلام پہنچے

میر حسنؔ

ولادت: ۱۷۲۳ء ۸؎
۴۱۔۱۷۴۰ء ۹؎
وفات: ۲۴؍ اکتوبر۔ ۱۷۸۶ء

میر حسن کا نام غلام حسن تھا۔ ضاحکؔ کے بیٹے اور میر انیسؔ کے دادا تھے۔ مثنوی سحر البیان کے ذریعہ آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ میر حسنؔ نے مرثیے اور سلام بھی کہے ہیں۔ لیکن ان دونوں اصناف کے کلام نایابی کی حد تک کم یاب ہیں۔ محمد آصفؔ نے لکھا ہے کہ

''پھر جن کے پاس ہیں وہ دینا کیسا دکھانے میں بھی بخل کرتے ہیں۔'' ۱۰؎

چند سلام جو دستیاب ہوئے ہیں نمونہ کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

میر حسنؔ کے سلام کا طرز روایتی اور رثائی ہے۔ پورے سلام میں شروع سے آخر تک سوگواری کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ جیسے مضامین جو ترقی یافتہ دور کے سلاموں کی امتیازی شناخت تصور کیے جاتے ہیں، ان کی کوئی علامت میر حسن کے سلاموں میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ زبان کی صحت وصفائی کے نمونے بدرجہ اتم موجود ہیں۔ محاورات اور ضرب الامثال کا برمحل استعمال شعر کے مفہوم میں دردانگیزی کو دوبالا کر دیتا ہے۔ سلاموں کی وہ تعریف جو غزلوں کی طرح ایک ہی شعر میں مفہوم کی مکمل ادائیگی سے عبارت ہے، کے تمام اوصاف بھی حسنؔ کے سلاموں میں موجود ہیں مندرجہ ذیل سلام کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ پورا سلام حضرت علی اکبر کو معنون ہے ؎

سلامی بین ماں کرتی تھی لے لے نام اکبرؑ کا — نہ چاہا گردش افلاک نے آرام اکبرؑ کا
دلا کر فاتحہ پانی پہ کہتی تھی یہی بانو — کہ یہ کوزہ علی اصغر کا ہے یہ جام اکبرؑ کا
قضا آئی جوانی میں نہ ہونے پائی شادی بھی — قیامت بھر رہا دنیا میں دل ناکام اکبرؑ کا

وطن میں ایک مدت انتظاری میں رہی صغرا | نہ پہنچا یا قضا نے اس تلک پیغام اکبرؑ کا
عجب غیرت تھی ماں کی اور پھوپھی کی بے ردائی پر | گیا روتا ہوا نیزہ پہ سرتا شام اکبرؑ کا
اذاں کا شور سن کر اہلبیتؑ شاہ والا میں | بپا ہوتا تھا ماتم روز صبح و شام اکبرؑ کا
بھرے تھے سینکڑوں ارمان دل میں آہ اے گردوں | چھدا نوک سناں سے وہ دل نا کام اکبرؑ کا
دم آخر تلک یہ شاہ عالم کا رہا عالم | لیا دل تھام آیا جب زباں پر نام اکبرؑ کا
تڑپ کر شام کے زنداں میں کہتی تھی یہی بانو | پڑا ہے ریگ صحرا پر تن گلفام اکبرؑ کا
نہ رخصت جنگ کی دیتی کبھی میں اپنے اکبرؑ کو | اگر میں جانتی ہووے گا یہ انجام اکبرؑ کا
کہا قاصد نے صغرا سے گیا میں متصل اس دم | شہ دیں روتے تھے، تھا آخری ہنگام اکبرؑ کا
کہا مجھ سے اسی حالت میں کہنا میری خواہر سے | دلانا فاتحہ پانی پہ، ہے پیغام اکبرؑ کا
رہی زندہ جہاں میں جب تلک بانوئے خستہ تن | فسانہ تھا زباں پر اس کے صبح و شام اکبرؑ کا

حسنؔ منظور ہے گر مغفرت اپنی قیامت میں
تو ہر دم چاہیئے رکھنا زباں پر نام اکبرؑ کا

زبان میں کہیں کہیں قدیم طرز کے لب ولہجہ کا در آنا فطری امر ہے مثلاً ''انتظاری میں رہنا ''اور ہوگا کے بجائے ''ہووے گا'' کا استعمال تو شاعری میں اب بھی روا ہے۔ اس اعتبار سے تقریباً ڈھائی سو سال پرانا یہ کلام زبان و بیان کی تازگی کے اعتبار سے آج بھی Date Upto معلوم ہوتا ہے۔

میر حسن کا ایک اور سلام نقل کیا جاتا ہے جس میں ہر شعر کا مضمون جدا اور غزل کے اشعار کی طرح مکمل مفہوم کا حامل ہے۔

مجرا کہو شبیر پہ اس طرح حزیں ہو | جو اشک کے سیلاب سے تر ساری زمیں ہو

سر اس کا علم پر ہو علم آہ کہ جو شخص
حیدرؑ کا نشاں دوش محمدؐ کا مکیں ہو

جز حضرت شبیر بھلا کون ہے یاور
جو ساجد و مسجود دم باز پسیں ہو

صد حیف ملے پیادہ روی اس کے پسر کو
کونین کی اقلیم کا جو تخت نشین ہو

خشک احمد مختارؐ کے کس طرح ہوں آنسو
تر خون میں شبیرؑ کے جب خنجر کیں ہو

سر ننگے نہ کس طرح سے ہوں فاطمہ نالاں
عریاں پڑی جب دشت میں لاش شہ دیں ہو

اے پیر فلک ہووے جو اکبر سا جواں آہ
تیر و تبر ظلم ہوا ور اس کی جبیں ہو

ہیہات جو ہو قوت بازوئے حسینی
شانہ کہیں، سر اس کا کہیں، پاؤں کہیں ہو

محتاج چدر ہو دیں وہ اے وائے کہ جن کے
یوں سلطنت ہر دو جہاں زیر نگیں ہو

ہے حضرت شبیرؑ سے یہ عرض حسنؔ کی
جا مشہد عالی پہ یہ پیوندِ زمیں ہو!!

غالبؔ

ولادت: ۱۷۹۷ء
وفات: ۱۸۶۹ء

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی شہرت اور مقبولیت تو ان کی غزل گوئی سے ہے یا خطوط نویسی سے۔ انھوں نے زندگی میں صرف ایک سلام کہا۔ لیکن ان کا ایک ہی سلام نایاب روزگار ہو گیا۔

سلام اُسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

نہ بادشاہ نہ سلطاں یہ کیا ستائش ہے
کہو کہ خامس آل عبا کہیں اس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی ؟
کہو کہ رہبر راہ خدا کہیں اس کو

خدا کا بندہ خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اس کو؟

فروغ جوہر ایماں حسینؑ ابن علیؑ
کہ شمع انجمن کبریا کہیں اس کو

کفیل بخشش امت ہے بن نہیں پڑتی ۔۔۔ اگر نہ شافع روز جزا کہیں اس کو
مسیح جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی ۔۔۔ ستم ہے کشتہ تیغ جفا کہیں اس کو
وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل ۔۔۔ شہید تشنہ لب کربلا کہیں اس کو
عدو کی سمع رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات ۔۔۔ کہ جن وانس وملک سب بجا کہیں اس کو
بہت ہے پایہ گردِ رہِ حسینؑ بلند ۔۔۔ بقدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اس کو
نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرۂ خاک ۔۔۔ کہ نوک جو ہر تیغ قضا کہیں اس کو
ہمارے درد کی یارب! کہیں دوا نہ ملے ۔۔۔ اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے حسن صبر کی داد! ۔۔۔ مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اس کو
زمام ناقہ کف اس کے میں ہے کہ اہل یقیں ۔۔۔ پس از حسینؑ علیؑ مرحبا کہیں اس کو
وہ ریگ تفتہ وادی پہ گام فرسا ہے ۔۔۔ کہ طالبان خدا رہنما کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں ۔۔۔ علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ ۔۔۔ بُرا نہ مانیے گر ہم برا کہیں اس کو
علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ ۔۔۔ کرے جو ان سے برائی بھلا کہیں اس کو؟
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے ۔۔۔ رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو
بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد ۔۔۔ غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

****

محمد حسین آزادؔ

ولادت: ۱۸۳۰ء
وفات: ۱۹۱۰ء

آزادؔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے۔ شاعری میں شیخ ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء میں والد کی اندوہناک شہادت کے بعد جب سارا گھر بار لٹ گیا تو پریشان

ہو کر لاہور چلے گئے۔ وہاں محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ تذکرہ ''آب حیات'' آزاد کا شاہکار ہے۔ انجمن پنجاب لاہور جس کے روح رواں حاؔلی سمجھے جاتے ہیں، وہ آزاؔد ہی کے اختراعی ذہن کا ثمرہ تھی۔

آزاؔد کے دو سلام دستیاب ہوئے ہیں، جس کی زبان و بیان اور طرز ادا میں قدیم و جدید دونوں رنگوں کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ مضمون خالص رثائی ہے ؎

اے مجرئی پھرا سر سرور کہاں کہاں — قرآں لیے پھرے ہیں ستم گر کہاں کہاں

مجرائی لے گئے ہیں ستم گر کہاں کہاں — در در پھرے ہیں آل پیمبرؐ کہاں کہاں

کہتا تھا طشت میں سر سرور کہ اور بھی — دیکھیں لئے پھرے ہے مقدر کہاں کہاں

گہہ طشت گہہ تنور میں گہہ نوک نیزہ پر — صدمے اٹھائے شہ نے ہیں سر پر کہاں کہاں

کوفہ میں در بدر کبھی دربار شام میں — پھرتے ہیں اہلبیتؑ پیمبرؐ کہاں کہاں

کہتے تھے رو رو اہل حرم راہ شام میں — پھرتے ہیں خاک چھانتے بے گھر کہاں کہاں

بدر و حنین، خیبر و خندق سے تا اُحد — دست خدا نبیؐ کا تھا یاور کہاں کہاں

دیکھو تو شان حق شب معراج عرش پر — حیدرؓ کہاں کہاں تھے پیمبرؐ کہاں کہاں

بندہ کو رکھیے اپنی غلامی میں یا امام
آزاؔد ہو کے جائے گا در در کہاں کہاں [۱۲]

داؔغ

نواب مرزا خاں داؔغ کا اصل نام ابراہیم تھا۔ داغ اپنی زبان دانی کے لئے مشہور ہیں اور سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے داؔغ کا زمانہ دہلوی مرثیہ نگاری کے عروج کا آخری زمانہ تھا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد ایک ایک

ولادت: دلّی ۱۸۳۱ء
وفات: حیدرآباد ۱۹۰۵ء

کر کے سبھی شعرا نے دہلی چھوڑ دی تھی۔

داغ کے سلام کا لب ولہجہ خالص رثائی اور روایتی ہے۔ ایک ایک مصرع غم والم کی تصویر اور عقیدت ومحبت کے جذبات سے لبریز ہے۔

ان کو مجرا جو تھے زیر آسماں بیٹھے ہوئے بھوکے پیاسے بے وطن بے خانماں بیٹھے ہوئے

شور ماتم سن کے اہلبیتؑ کا سب اہل شام شادیاں کرتے تھے گھر میں شادماں بیٹھے ہوئے

وادریغا دست عابد میں تو ہو ان کی مہار اور اونٹوں پر چلیں کچھ سارباں بیٹھے ہوئے

امت عاصی کے حق میں شاہ نے مانگی دعا جانب قبلہ زمیں پر نیم جاں بیٹھے ہوئے

کوفیوں نے خود بلا کر یہ ستم بر پا کیا اپنے گھر تھے چین سے شاہ زماں بیٹھے ہوئے

حلق پر خنجر چلا سبط رسول اللہ کے کھائی ہیں عابد نے غم کی برچھیاں بیٹھے ہوئے

بیٹھے بیٹھے پشت زیں پر ہی پڑھی شہ نے نماز زخم کاری تھے بہت تا استخواں بیٹھے ہوئے

کہہ رہے تھے العطش جس وقت سب اہل حرم سب کی سنتے تھے شہ کون ومکاں بیٹھے ہوئے

حضرت عابد کو بھی زنداں میں تھا اتنا لحاظ ہم سے غافل ہوں نہ در پر پاسباں بیٹھے ہوئے

شاہ کے ماتم میں روئے ہیں بہت حور وملک دیکھنا جنت میں بھی ہوں گے مکاں بیٹھے ہوئے

حج زیارت کر چکے اب کربلا کو بھی چلو
داغ مدت ہوگئی تم کو یہاں بیٹھے ہوئے [۱۳]

*****

حوالہ (تیسرا باب)

سلام گوئی کا ابتدائی دور (شمالی ہند میں)

۱۔ تذکرہ ریختہ گویاں از فتح علی گردیزی۔ مطبوعہ ۱۹۳۳ء ص: ۱۶۶

۲۔ نکات الشعرا، میر تقی میرؔ۔ ص: ۸۳

۳۔ تلخیص از دیوان یکرؔو مرتبہ شمیم احمد اور دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔ محمد حسن

۴۔ مزید تفصیلات کے لئے نصیر حسین خیالؔ کی ''مغل اور اردو'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ وفیات مشاہیر اردو۔ بشارت علی فروغؔ۔ ص: ۱۲۰۔ تذکرہ ماہ و سال۔ مالک رام میں سن ولادت ۱۵ جون ۱۷۲۸ء درج ہے۔

۶۔ سال اشاعت ۱۹۹۳ء

۷۔ سوداؔ۔ شیخ چاند۔ ص: ۳۱۲

۸۔ بحوالہ اسلاف و اخلاف میر انیس۔ ص: ۶۷

۹۔ تذکرہ ماہ و سال۔ مالک رام۔ ص: ۱۳۱۔ اور وفیات مشاہیر اردو۔ ص: ۲۱۸

۱۰۔ اسلاف و اخلاف میر انیس۔ ص: ۷۵

۱۱۔ اسلاف و اخلاف میر انیس۔ چص: ۷۷۔۷۶

۱۲۔ از کلیات محمد حسین آزادؔ۔ ترتیب و تدوین ڈاکٹر محمد خالد علی صدیقی

۱۳۔ از مرثیہ و سلام نمبر (''العلم'' سہ ماہی۔ ۱۹۹۳ء)

چوتھا باب

سلام کی صنف کے عروج کا زمانہ

(الف) متوسطین کی سلام گوئی

(ب) متاخرین کی سلام گوئی

شمالی ہندوستان میں سلام گوئی کا سلسلہ جنوبی ہندوستان سے آمد و رفت اور علمی و ادبی لین دین کے ذریعہ شروع ہوا۔ اس لین دین کے سلسلے کا آغاز اس وقت ہوا جب جنوب کی ریاستوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور دلی کی سلطنت بھی شکست و ریخت کی منزلوں سے گذر رہی تھی۔ لیکن سلام گوئی کی ترقی کا زمانہ بھی وہی تھا جو مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ سلطنت کے زوال کے آخری ایّام جب سلام کی صنف کے لئے بھی ناسازگار اور ناموافق ہونے لگے تو یہ صنف اپنے قدر دانوں کے ساتھ ہجرت کر کے دلّی سے اودھ آ گئی۔

شمالی ہندوستان میں دہلی کے بعد اودھ کا علاقہ تقریباً تمام اصناف شاعری کے لئے مناسب، موزوں اور زرخیز ثابت ہوا۔ اس طرح دہلی کے اجڑے ہوئے چمن کو اودھ کی سازگار اور خوشگوار فضا میں لہلہانے اور پھلنے پھولنے کا پورا موقع ملا۔

اودھ میں سلام گوئی کے سلسلے کو دو حصّوں میں تقسیم کی گیا ہے۔ پہلا حصہ سلام گوئی کے ترقی یافتہ زمانے کو محیط ہے، اور یہ دو طرح کے حالات سے متاثر ہے۔ پہلی صورت حال اودھ کی ریاست کی خوش حالی کے زمانے سے عبارت ہے اور دوسری حکومت اودھ کی تباہی اور زوال کے بعد کے زمانے کا احاطہ کرتی ہے۔ پہلے حصے کے سلاموں پر غزلیت اور خوش دلی کا رنگ غالب ہے اور دوسرے حصے کے سلاموں پر رثائیت کے ساتھ اداسی اور خاموشی کے اثرات کا ملا جلا سایہ ہے۔ دوسرے حصّہ میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کی تباہی و تاراجی کے بیانات کا استعاراتی عکس کہیں آہستگی اور کہیں بلند آہنگی کے ساتھ حسرت و یاس کی ملی جلی فضا میں نظر آتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے کے شعرا میں کچھ ایسے ہیں جو دلی سے اودھ آئے تھے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب دیکھنے والی جماعت نے اودھ کی خوش حالی کے بعد وہاں کی بدحالی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس وجہ سے ان شعرا کے یہاں انقلاب کے بعد کی شاعری میں ملال اور اداسی کا عنصر غالب ہے۔ اس کے بعد متاخرین کا زمانہ آتا ہے جن کی ابتدا انیسؔ و دبیرؔ کی زندگی کے آخری ایام سے ہوتی ہے۔ ان شعرا کا کلام ۱۸۵۷ء کی تباہی و تاراجی کے اثرات

سے خالی ہے اور ایک نئے مزاج اور رویہ کا پتہ دیتا ہے۔

اس باب میں دونوں زمانوں کے شعرا کا ذکر ہے۔ ان کے کلام کے نمونوں سے مذکورہ بالا بیانات اور دعوؤں کی تصدیق ہوگی۔

سلام کی صنف کے عروج کا زمانہ

(متوسطین کی سلام گوئی)

دلگیر [1]

ولادت: ۱۷۸۳ء [2]

وفات: ۱۸۴۸ء

دلگیر نے سلام بہت کہے۔ مرثیوں کی بہ نسبت انکے سلاموں کو شہرت بھی زیادہ ملی۔ شاؔد عظیم آبادی نے دلگیر کے سلاموں کے دیوان کی ترتیب کے سلسلے میں لکھا ہے:

''غالباً سلام کا دیوان ردیف وار انھوں نے ہی جمع کیا ہے۔'' [3]

اب تک تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سلام میں بطور غزل شعر کہہ جانا دلگیر کی ہی ایجاد ہے۔ بعد میں دیگر اساتذہ نے اس کی پیروی کی۔

مرثیہ گوئی کو ترقی یافتہ نہج عطا کرنے والوں میں دلگیر کا نام بہت اہم ہے۔ دلگیر کی زبان میں لکنت تھی، اس وجہ سے ان کے مرثیے دوسرے مرثیہ خواں پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانے کی مجالس میں بیشتر سوز خواں دلگیر کے ہی مرثیے پڑھتے تھے۔ دوسرے مرثیہ گویوں کی بہ نسبت ان کے مرثیوں کو شہرت اور مقبولیت اس وجہ سے زیادہ ہوئی کہ ان کے مراثی عزائی اور بینیہ ہوتے تھے۔

دلگیر کے سلام بھی مرثیوں ہی کی طرح عزائی اور رثائی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوتے تھے۔ بعد میں کچھ انحراف نظر آتا ہے۔ یہ وہی انحراف ہے جس کی بنیادوں پر انیؔس و مونسؔ نے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کیں۔

عیب کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر
پر یہاں قدر شناسانِ سخن تھوڑے ہیں

سلامی وصف زلف شاہ خوش خو ہونہیں سکتا — رہِ باریک ہے دخل اک سر مو ہونہیں سکتا

رثائی سلام کے چند شعر دیکھیں۔

اُس کو مجرا جو یہ بولے غم سہا جاتا نہیں
دھیان بابا کا مرے صبح و مسا جاتا نہیں

کہتی تھی صغرا وطن میں خط میں بھیجوں کس کے ہاتھ
کوئی قاصد بھی بہ سوئے کربلا جاتا نہیں

کہتی تھی قاسم کی ماں رو رو نہ جا قاسم نہ جا
سہرے اور جوڑے سے مرنے کو بنا جاتا نہیں

بولی زینب فوج آپہونچی اٹھو بیٹا اٹھو
بولے عابد ناتوانی سے اٹھا جاتا نہیں

کہتے تھے ظالم اٹھالے پاؤں چل اے ناتواں
بولے عابد کانٹے چبھتے ہیں چلا جاتا نہیں

جب کوئی کہتا تھا پانی پی تو عابد کہتے تھے
بابا پیاسے مر گئے پانی پیا جاتا نہیں

راہ خالق میں اٹھائی ہے وہ لذت پیاس کی
آج تک اس پیاس کا منہ سے مزہ جاتا نہیں

اس قدر رقت ہے اے دلگیر مجھ کو اس گھڑی
آگے حال سبط پیغمبرؐ لکھا جاتا نہیں

غزل کی لفظیات میں سلام کے دو شعر دیکھیں۔

مجرئی لاش پسر شہ سے چھپائی نہ گئی
بانو کے روبرو کچھ بات بنائی نہ گئی

لشکر حر کو دیا پیاس میں پانی شہ نے
تھا سخی ابن سخی آنکھ چرائی نہ گئی

مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کو شعر گوئی کا ذوق بچپن سے تھا۔

ولادت: ۱۷۴۷ء
وفات: ۱۸۲۴ء

غزلیں کہتے تھے۔ زمانے کے رجحان اور لکھنؤ کی مرثیہ گوئی کی عام فضا سے متاثر ہو کر مصحفی نے سلام اور مرثیے بھی کہے۔

ان کے سلام روایتی طرز سلام گوئی کی عمدہ مثال ہیں۔ دو سلاموں سے چند شعر نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

سلامی اشک سے یہ چشم مومنیں تر ہے
کہ جس سے فرش ہے نمناک اور زمیں تر ہے

یہ پُر ہوئے ہیں شہیدوں کے خون سے تھالے | کہ قتل گاہ کی دود و وَجَبٗ زمیں تر ہے
لکھوں میں حال شہیدوں کا مصحفیؔ کب تک | کہ دیدۂ قلم معجز آفریں تر ہے

سلامی دیکھ امام زماں کے تن کی طرف | پھر اس کے بعد لہو ڈوبے پیرہن کی طرف
لگے تھے زخم زبس پیکر مقدس پر | نگاہ جاتے ہوئے ڈرتی تھی بدن کی طرف
کھلی تھی آنکھ جو اس سرورِ شہید اس کی | رہی تھی دیکھ وہ اس وقت بھی بہن کی طرف
کدائے لاشوں پہ گھوڑے ستم شعاروں نے | نگاہ کی جیو اس قوم کے چلن کی طرف

مصحفیؔ نے اسی سلام کے مقطع میں اپنی زبان کی فصاحت اور امتیاز کی جانب اس طرح اشارہ کیا ہے۔

ہے مصحفیؔ کے کلام فصیح میں یہ سلام | ذرا زبان کی طرف دیکھ اور سخن کی طرف

خلیقؔ

ولادت: ۱۷۶۸ء
وفات: ۱۸۴۴ء

میر مستحسن خلیقؔ کے زمانے تک سلام کو مجرا، مجرئی یا سلام، سلامی کے الفاظ سے شروع کرنا لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ سلاموں کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کا کوئی شعر اہلبیتؑ کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ سلام کے بیشتر اشعار میں اہلبیتؑ کے مصائب اور کربلا کے واقعات کا ذکر ہوتا تھا۔ واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کے باندھے جانے کا رجحان بہت کم تھا۔ خلیقؔ نے اپنے سلاموں میں کہیں کہیں کچھ اپنے بارے میں نظم کیا ہے۔

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا | دنداں گئے کہ جو ہر تیغ زباں گیا
گذری بہار عمر خلیقؔ اب کہیں گے سب | باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

مجرائی تیر گردن اصغر پہ چل گیا　　اگلا لہو شلو کے پہ اور دم نکل گیا
کہہ جایئے وہ نظم غم شہ کہ سب کہیں　　مضموں نہ تھے خلیقؔ جواہر اگل گیا

ایک اور شعر دیکھیں جس میں حضرت قاسم کی شادی کی طرف اشارہ ہے۔ اس شعر میں شادی اور غم دونوں کے جذبات اور احساسات بڑی خوبی اور شاعرانہ فن کاری کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں۔

اے مجرئی آئینے میں منہ دیکھ دلہن کا
صدقے ہوا سو جان سے دل ابن حسنؑ کا

اس شعر کے فوراً بعد خالص مصائب کے شعر دیکھیں۔

زینب سے گلے مل کے یہی کہتے تھے شبیر　　کیا قہر ہے بھائی سے جدا ہونا بہن کا
اعدا نے کہا مارلو اکبرؑ کو کسی طور　　کچھ کام نہیں مارنا پھر شاہ زمن کا

ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ کی شناخت اور شہرت

ولادت: ۱۷۷۳ء
وفات: ۱۸۳۸ء

دبستان لکھنؤ کے بانی کی حیثیت سے ہے۔ ناسخ زبان کی اصطلاح اور صفائی کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اشعار میں ان کی پوری توجہ زبان کی صفائی پر ہی ہوتی تھی۔

ناسخ نے بادشاہ یا امرا کی شان میں قصیدے نہیں کہے۔ لیکن اہلبیتؑ کی شان میں ان کے متعدد قصیدے موجود ہیں۔ غزلوں میں بھی جابجا مذہبی عقیدت مندی کے اشعار ملتے ہیں۔

ناسخ ہیں مصطفےؐ و علیؑ دونوں ایک نور　　ان کو امام ان کو پیمبر بنا دیا

یہ معجزہ ہے حسینؑ شہید کا ناسخ — کہ خاک ہوگئی سب خون ناب شیشے میں

ہے محرم نخل ماتم کے لئے فصل بہار — تازہ ہوتا ہے غم شاہ شہیداں ہر برس

روز محشر بے گماں ناسخ وہ بخشا جائے گا — ہے محبت جس کو محبوب خداؐ کی آل سے

مدحیہ انداز کا ایک سلام بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ پورے سلام میں کہیں کوئی بینیہ شعر نہیں ہے۔ نہ سلام، سلامی اور مجرا، مجرائی کا التزام ہے۔

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا — روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

بیعت خدا سے مجھ کو ہے بے واسطہ نصیب — دست خدا ہے نام مرے دستگیر کا

ایثار دیکھنا کہ عیاں ہل اتٰی میں ہے — مسکیں کے بعد ذکر یتیم و یسیر کا

انگشت اپنی دے کے سلیمان کر دیا — طاعت میں بھی سوال سنا گر فقیر کا

پوچھا جو حال تخت سلیماں سے ایک دن — بولا کہ زینہ ہوں میں علی کے سریر کا

بخشش کی ہے امید علیؑ کبیر سے — ہوتا ہوں مرتکب جو گناہ کبیر کا

جب تک نہ آب پاک دہان نبیؐ پیا — اس شیر کے نہ دل میں خیال آیا شیر کا

ناسخ کا ادعا ہے یہی روز باز پرس
میں ہوں غلام شاہ رسل کے وزیر کا

ناسخ کی ایک عزائی رباعی دیکھیں ۔

تھم جائیں غم شاہ میں کیوں کر آنسو — جاری ہی رہیں گے زندگی بھر آنسو

پیتا ہوں جو یاد عطش شاہ میں آب — بہتا ہے چشم تر سے بن کر آنسو

فصیح

ولادت: ۱۷۷۲ء

وفات: ۱۸۵۳ء

مرزا محمد جعفر فصیح نے سلام گوئی کا جونرالا اورا چھوتا انداز اپنایا اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ان کے سلام قاری اور سامع دونوں کے اندر ایک طرح کا کیف پیدا کر دیتے ہیں، اور دل امنڈا چلا آتا ہے۔

وہ سلام کہیے حسینؑ پر کہ بہشت جس کا صلہ ملے
یہ طلب تو اپنی طرف سے ہے، یہ وہاں سے دیکھئے کیا ملے

الفاظ کی سادگی، بحروں کی روانی لہجہ کے ترنم اور نغمگی میں عقیدت و محبت کا ایک سیلاب موجزن نظر آتا ہے۔ شادؔ عظیم آبادی نے فصیح کے سلاموں کی فصاحت و بلاغت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''جب مرزا فصیح کا سلام پڑھا جاتا تھا تو مرزا دبیرؔ جھومنے لگتے تھے۔ اور میر انیسؔ کو یہ کہتے سنا کہ فصیح حقیقت میں اسم بامسمیٰ ہے''۔ ۵

فصیح نے بہت بار حج و زیارت کا سفر کیا اور وہاں قیام کے دوران بہت سے سلام کہے۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبہ کے سنگ در پر سیاہ پردہ پٹک رہا ہے

جو سلام کہے بصد ادب شہ تشنہ لب کی جناب میں
وہ بروز حشر عجب نہیں کہ رواں ہو شہ کی رکاب میں

کفن پہنے شہ مظلوم کے انصار رن میں تھے
سلامی چاند سے چہرے وہ تابندہ کفن میں تھے

فصیح کے علاوہ یہ منفرد طرز اور لب ولہجہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتا۔

اعجاز

اعجاز، نواب آصف الدولہ والی اودھ کے بیٹے تھے۔ نام نجابت علی خاں تھا۔ غزل، قصیدے، سلام اور مرثیے میں استاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ امیر علی جونپوری نے ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

ولادت ووفات: تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔

> ''تعجب ہے کہ اتنے اچھے شاعر کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔''[۶]

سلام کے نمونے سے اعجاز کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ اشعار کا تاثر رثائی اور بینیہ ہے۔

سلام اس پر جو دکھ میں مبتلا ہے　　لہو میں غرق سر سے تا بپا ہے
نہ کوئی یار ہے نے آشنا ہے　　گلا کٹوانے کو تنہا کھڑا ہے
ہزاروں نیزے ہیں اور ایک تن ہے　　ہزاروں تیغیں ہیں اور اک بدن ہے
ہزاروں تیر اک تشنہ دہن ہے　　مسافر کو قضا کا سامنا ہے
نماز ظہر کا جب وقت آیا　　وضو کرنے کو پانی بھی نہ پایا
تیمّم کر کے وہ زہراؑ کا جایا　　نماز ظہر رن میں پڑھ رہا ہے
پڑے ہیں رن میں لاشے یاوروں کے　　گلے کاٹے گئے ہیں دلبروں کے
یہ فرماتا ہے آگے خود سروں کے　　کہ مجھ پہ کیوں یہ سب جور و جفا ہے
علیؑ مرتضٰی کا میں پسر ہوں　　جناب فاطمہؑ کا میں قمر ہوں
حسنؑ کا بھائی آرام جگر ہوں　　مرا نانا محمد مصطفےٰؐ ہے

میر انیسؔ

ولادت:۱۸۰۳ء
وفات:۱۸۷۴ء

میر انیس کا نام میر ببر علی تھا۔ میر مستحسن خلیقؔ کے سب بڑے بیٹے تھے اس لئے لوگ انھیں بڑے میر صاحب کہا کرتے تھے۔ انیس کی ولادت فیض آباد کے محلّہ گلاب باڑی میں ہوئی۔ فیض آباد اور لکھنؤ کے نامور علماء اور صاحبان فکر وفن سے کسب فیض کے بعد شاعری کے میدان میں قدم رکھا اور اپنے والد کی شاگردی اختیار کی۔ مرثیہ خوانی کا ہنر بھی انھوں نے اپنے والد سے ہی سیکھا تھا۔ شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی جس کا اثر ان کے سلاموں پر صاف نظر آتا ہے۔ بعض سلاموں کو انھوں نے اپنی سابقہ غزلوں کی زمین اور اُسی ردیف وقافیہ میں کہا ہے۔ ان اشعار میں ان کی طبیعت کی شوخی اور ظرافت کی جھلک صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایک غزل کے تین شعر اور اسی زمین میں سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں کچھ اشعار غزل اور سلام دونوں میں مشترک ہیں۔

غزل

اشارے کیا نگہ ناز دلربا کے چلے — ستم کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے

پکارے کہتی تھی حسرت سے نعش عاشق کی — صنم کدھر کو ہمیں خاک میں ملا کے چلے

مثال ماہی بے آب موجیں تڑپا کیں — حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

سلام

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے — خدا کے آگے خجالت سے منہ چھپا کے چلے

خیال آ گیا دنیا کی بے ثباتی کا — چلے جہاں سے جو اصغر، تو مسکرا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی — چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا — انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو اٹھا کے چلے

حسینؑ کہتے تھے وا حسرتا ! علی اکبرؑ بہار باغ جوانی ہمیں دکھا کے چلے

ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلبیتؑ امام مزار شاہ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے

رہی غرور سے نفرت خجستہ کاروں کو قلم کی طرح چلے جب، تو سر جھکا کے چلے

تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انیسؔ سے پہلے سلام گوئی کا عمومی مزاج مدحیہ اور رثائی تھا اور یہی طریقہ انیسؔ کے زمانے تک جاری رہا۔ انیسؔ نے اخلاقی مضامین، یہاں تک کہ بینیہ اور غم انگیز مضامین میں بھی ایک انوکھے اور نرالے قسم کا تغزل پیدا کیا ہے۔

غم زلف شبیر کیا دل سے نکلے وہ لیلیٰ نہیں ہے جو محمل سے نکلے

حُر آیا اِدھر اور جگر بند اس کا یہ دو اسم اس نقش باطل سے نکلے

انیسؔ کے زمانے تک سلاموں میں ایک خاص بات یہ ہوتی تھی کہ ہر سلام ''سلام اس پر'' یا ''مجرا اُسے'' یا ''سلامی'' یا ''مجرائی'' سے شروع ہوتا تھا۔ سلام عموماً مرثیوں کی طرح مسلسل ہوتے تھے اور ہر شعر مصائبِ اہلبیت اور ذکر شہدائے کربلا اور دیگر واقعات کوفہ وشام کے ذکر کے لئے وقف ہوا کرتے تھے۔ ذاتی یا عوامی زندگی کے معاملات یا تغزل و تصوف کے مسائل و مضامین کے لئے جگہ سلاموں میں عموماً بہت کم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شاعر مطلع یا مقطع میں اپنے بارے میں کچھ نظم کر دیا کرتا تھا۔ جیسے خلیقؔ نے کہا تھا۔

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا دنداں گئے کہ جو ہر تیغ زباں گیا

گذری بہار عمر خلیقؔ اب کہیں گے سب باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

انیسؔ نے قدما کی بندھی ٹنکی علامات اور پابندیوں سے رفتہ رفتہ آزاد ہونا شروع کیا۔ اس طرح سلام کے مضامین میں وسعت اور اس کی شعریات میں آفاقیت پیدا ہونی شروع ہوئی۔

پڑا جو عکس تو ذرہ بھی آفتاب بنا — خدا کے حکم سے جسم ابوتراب بنا

شبیہ امام زماں کھینچتے ہیں — تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے — شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

انیسؔ کے کسی سلام میں مسلسل واقعات کا بیان نہیں ملتا۔ انھوں نے ایک ہی سلام میں مختلف مضامین نظم کیے ہیں۔ ایک شعر میں کربلا کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے تو دوسرے میں اہلبیتؑ کی کسی فضیلت کا بیان ہے، تیسرے میں کسی واردہ قلبی کا بیان ہے تو چوتھے میں ناپائیداری دنیا کا ذکر اور اخلاقیات کا درس ہے۔

سلاموں میں رثائی اور غزلیہ رنگ کے اشعار کی خوبصورتی اور طرفگی ملاحظہ ہو۔

لائے رخصت کے لئے گھر میں جو عباس کو شاہ — باہیں گردن میں عجب پیار سے ڈالے آئے

اک افسانۂ بے کسی رہ گیا — نہ قاتل رہا اور نہ سرور رہے

خاک وخوں میں جو بھریں گیسوئے مشکینِ حسینؑ — کس طرح خاک سے سنبل نہ پریشاں نکلے

خوں بھرا شہ سے گریبان چھپایا نہ گیا — لاش اصغر کی تو دامن میں چھپالے آئے

انیسؔ کے سلاموں میں ایسے اشعار بہ کثرت ہیں جن میں ذاتی مسائل ومعاملات اور اخلاقیات کا ذکر ہے۔انیسؔ نے سلام کے اشعار میں اپنے فن کے کمال اور زمانے کی ناقدری کو نہایت پُراثر، پُردرد، حسرت انگیز اور دل آویز لہجہ میں بیان کیا ہے۔

الٰہی مجھی میں نہ تھی کچھ وفا کہ دنیا ہی سب بے وفا ہو گئی
نہ گل میں محبت نہ بلبل میں انس الٰہی یہ کیسی ہوا ہو گئی

جوسخی ہیں مال دنیا سے ہیں خالی ان کے ہاتھ
اہل دولت جو ہیں وہ دست کرم رکھتے نہیں

دبیرؔ

ولادت:۱۸۰۳ء؍۱۸۰۴ء
وفات:۱۸۷۵ء

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے عہد تک سلام گوئی کا انداز روایتی تھا۔تھوڑی سی ترقی زبان کی صفائی اور ہمواری کی سطح پر ضرور ہوئی تھی۔مگر یہ ترقی شاعرانہ جدت پسندی سے خالی تھی۔

انیسؔ اور مونسؔ کے یہاں آکر سلاموں کے قدیم رثائی طرز میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔لیکن دبیرؔ کے سلاموں میں (رثائی) مضامین کے علاوہ عام رنگین مضامین کے اشعار کم ملتے ہیں۔زماں آزردہؔ نے ان کی سلام گوئی کے طرز اور رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کی طبیعت پر چونکہ مرثیت غالب تھی جس کی وجہ سے ان کا کلام بہت مُبکی ہوتا تھا''۔ [7]

مجرا اُسے مدام جو راہ رضا میں تھا
خنجر تھا جب گلے پہ وہ شکر خدا میں تھا

اگر چہ دبیرؔ کے سلاموں میں رثائی موضوعات کی شمولیت کے ساتھ ساتھ غزل کی لفظیات کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔

فصل خزاں جو گلشن شاہ زمن میں ہے مجرائی گل دریدہ گریباں چمن میں ہے

صغرا جو انتظار امام زمن میں ہے وا اس کی چشم مجرئی ابتک کفن میں ہے

دبیرؔ کے رثائی سلام مضامین اور طرز بیان کے اعتبار سے اپنی صنف کے شاہکار ہیں۔

سلامی کہتے تھے ظالم رلاؤ زینبؑ کو کہ ذبح شہ کو کرو اور دکھاؤ زینبؑ کو

اٹھا ہے رات کو تابوت اس کی اماں کا جہاں میں دن کو کھلے سر پھراؤ زینبؑ کو

محمد واجد علی شاہ اخترؔ

ولادت: ۱۹؍جولائی ۱۸۲۳ء

وفات: ۲۱ستمبر ۱۸۸۷ء

واجد علی شاہ کے سلاموں کا ایک مکمل دیوان ''ایمان'' کے نام سے ہے۔ اس دیوان کے بارے میں کوکب قدر نے لکھا ہے:

''ہاشم برہانپوری کے دیوان حسینی کے بعد سے اردو شاعری میں علاوہ ''ایمان'' کے اور کوئی دیوان نوحہ سلام سے شاید مرتب نہیں ہوا''۔ ۸

کوکب قدر نے اس دیوان کو واجد علی شاہ کی جدت طرازی کی یادگار سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان کے سلاموں کی ادبی اور معنوی حیثیت پر سوالات بھی کھڑے کیے ہیں:

''واجد علی شاہ کی غزلیں ان کی مثنویوں سے کم رتبہ اور سلام ان سے بھی گئے گذرے ہیں............غزل اور بالخصوص سلاموں میں ذرا سی لغزش بھی نہایت مکروہ

> نظر آتی ہے۔غزلوں میں تو واجد علی شاہ نے پھر بھی احتیاط
> برتی..............لیکن انفرادیت پیدا کرنے کی دھن
> میں واجد علی شاہ نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا کہ مرثیے
> اور سلام کی زمین کتنی مقدس اور محدود ہے''۔ ۹

مرثیوں میں غلط اور ضعیف روایتوں کے نظم کیے جانے کی گنجائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کوکب قدر نے لکھا ہے کہ اس طرح کی آزادی سلاموں میں حاصل نہیں۔لیکن انھوں نے کسی سلام سے کوئی مثال نہیں دی:

> ''مرثیوں میں غلط اور ضعیف روایتیں نظم کرنے کی
> علت اگر قبول کر لی جائے جب بھی سلاموں میں بے تکے
> قافیے ذوق لطیف پر بار ہوتے ہیں''۔۱۰

کوکب قدر کے ذریعہ کیے گئے تجزیے سے واجد علی شاہ کے سلاموں کی کوئی خوبی یا انفرادیت ظاہر نہیں ہوتی۔صرف واجد علی شاہ کے سلاموں کے وجود اور سلاموں کے دیوان کا پتہ چلتا ہے۔

واجد علی شاہ کے سلاموں کے دیوان''ایمان'' کا نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔اگر چہ ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔لیکن اس قدر خستہ حالت میں ہے کہ لائبریری انتظامیہ کی جانب سے اس سے استفادے کی فی الحال اجازت نہیں ہے پورے دیوان کو جدید تکنیک کے ذریعہ کمپوٹر میں محفوظ کرنے کا کام چل رہا ہے۔جب یہ کارروائی مکمل ہو جائے تبھی کتاب کے متن کو دیکھا جا سکے گا۔فی الحال ایک سلام کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو کوکب قدر نے اپنی کتاب''واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات'' میں''ایمان'' کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔لیکن ان کے نقل کردہ اشعار ان کی اس رائے کے خلاف جاتے ہیں جس میں انھوں نے واجد علی شاہ کے سلاموں کو''گیا گذرا'' قرار دیا ہے۔

۱۔ دشت وکوہ ونور ونار وشمس وماہ وخاص وعام

خشک وتر، سرخ وسفید، ان سب کا مالک ہے امام

۲۔ معدن جود وسخا، بحر شجاعت، پیشوا

مخزن لطف وکرم، درّ امامت، نیک نام

۳۔ اے در دریائے رفعت، ہادی دین مبیں

مطلع دیوان احمدؐ، تم پہ مادح کا سلام

۴۔ شہر یار ملک ہمت، قاطع بازوئے کفر

تاجدار شہر غربت، رازدار خاص وعام

۵۔ معنی آل عبا، محبوب یزداں پارسا

بیت ومضمون عطا، جان رسولؐ نیک نام

۶۔ سبط احمدؐ، روح زہراؑ، پارہ جان علیؑ

اے حسنؑ کے بھائی نور دیدۂ خیرالانام

۷۔ شاہ شاہان جہاں، سلطان دیں، حبل المتین

ماہتاب چرخ رفعت، آفتاب لعل فام

۸۔ قصر دل میں یاد ہو جب چہرۂ پُرنور کی

مہر عالمتاب حشمت کیوں نہ ہوئے روئے بام

۹۔ سائل درگاہ والا دو جہاں میں سیر ہے

مدح خواں کے تم ہو شاہا، تم سے ہے ہر وقت کام

۱۰۔ نجم وافلاک وقمر، خور، سطح دریا، نیک وبد

رکھتے ہیں جن وبشر، دیو وپری، سب تم سے کام

۱۱۔ یاد کیجئے گا ضرور اختر کو اے ماہ بتولؑ

آیئے گا ساتھ مہدیؑ کے جو بہر انتقام [۱۱]

سلام کے مذکورہ بالا اشعار کے سلسلے میں کوکب قدر کی وضاحت ملاحظہ ہو:

''سلام کے مندرجہ بالا اقتباس میں جذبات کے ساتھ ان کی فن کارانہ تہذیب کو بھی دخل ہے۔لیکن ان کے کلام کا بیشتر حصّہ اس تکلیف سے بے نیاز ہے۔غزلوں کی طرح قافیہ پیمائی کی کوشش نوحہ وسلام میں بھی ہےلیکن یہاں وہ اپنے خیالات کوآراستہ کرنے کی فکرنہیں کرتے۔ان کی اس شاعری میں مصوری کی کوشش بھی نمایاں ہے۔'' [۱۲]

انسؔ

میر مہر علی انسؔ میر انیسؔ کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔

ولادت:۱۸۰۸ء

وفات:۱۸۹۲ء

مرثیہ خوانی کی مشق اور شاعری پر اصلاح میر خلیقؔ سے لیتے تھے۔خلیقؔ کے انتقال کے بعد بڑے بھائی انیسؔ سے اصلاح لینے لگے۔دوسرے مرثیہ گویوں کی طرح انسؔ نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔

اس کے دیدار کی رہتی ہیں طلب گار آنکھیں

آشنا آپ سے کیا ہوں مری بیمار آنکھیں

انسؔ کی غزلوں اور سلاموں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو سلام گوئی کا انداز غزل گوئی کے اور غزل گوئی کا انداز سلام گوئی کے بہت قریب نظر آئے گا۔

اے سلامی دل مرا اس پیشوا کے ساتھ ہے

خضر سا یہ کی طرح جس رہنما کے ساتھ ہے

انس میر انیس کے ہم عصر تھے اور اسی انداز کی شاعری کرتے تھے جو ان کے بزرگوں کا حصّہ سمجھی جاتی تھی۔ اس وجہ سے ان کے یہاں روایتی عناصر کا غلبہ ہے۔

دل پنجتنؑ پاک پہ قرباں ہے ہمارا — مجرائی یہ مذہب ہے یہ ایماں ہے ہمارا

فرماتے تھے شہ کس سے کروں شکوۂ امت — اللہ پہ ظاہر غم پنہاں ہے ہمارا

ہم ان کو دعا دیتے ہیں وہ دیتے ہیں ایذا — ان کا یہ سلوک اور یہ احساں ہے ہمارا

اے انس مہ برج امامت پہ فدا ہیں

کیا اختر اقبال درخشاں ہے ہمارا

نفیس

ولادت: ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۹ء

وفات: ۱۳۱۸ھ یا ۱۹۰۰۔۱۹۰۱ء

نفیس کا نام میر خورشید علی تھا۔ میر انیس کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ فن کے اعتبار سے بھی وہ اپنے بھائیوں میں سب سے بہتر تھے۔ مرثیہ گوئی میں انھیں اپنے والد سے اتنا فیض حاصل ہوا کہ انیس و نفیس کے مرثیوں میں فرق کرنا مشکل ہے۔

نفیس کے سلام رثائی عناصر سے خالی ہیں۔ البتہ مودت و عقیدت کے جذبات سے لبریز نظر آتے ہیں۔

صاف دل ہیں کینہ و بغض و حسد رکھتے نہیں — دوست کا کیا ذکر دشمن سے بھی کد رکھتے نہیں

جز خدا و مصطفیؐ و آل پاک مصطفیؐ — اور سے دنیا میں امید مدد رکھتے نہیں

ساتھ لے جاتے ہیں دے کر راہ حق میں ذی شعور — چھوڑ جانے کے لئے زر با خرد رکھتے نہیں

پاس ہے خط غلامی علیؑ کیا ہم کو خوف — وہ ڈریں جو لوگ بخشش کی سند رکھتے نہیں

اسی سلام کے دو اشعار میں واردات قلبیہ کا اظہار بھی صاف طور پر نظر آتا ہے۔

بعد مرنے کے احبا ہم کو بھولے اس قدر　　پھول بھی دولا کے بالائے لحد رکھتے نہیں
دوستوں نے ہم سے کھینچا دست شفقت بعد مرگ　　فاتحہ کو ہاتھ بالائے لحد رکھتے نہیں

نفیسؔ سلاموں میں کہیں کہیں پند آمیز لہجہ اپناتے ہیں۔

بد کہیں سب نیک، وہ نیت نہ کر　　خاکساری کر انانیت نہ کر
بے وفا ہے بے وفا ہے بے وفا　　دیکھ دنیا سے کبھی الفت نہ کر
سائلوں کو دے جواب باصواب　　کر نہ کج خلقی اگر ہمت نہ کر
جرم بے لذت اسی کا نام ہے　　دوست کیا دشمن کی بھی غیبت نہ کر
مثل گل چہرہ شگفتہ رکھ نفیسؔ　　غنچہ پیشانی نہ ہو خست نہ کر

مونسؔ [۱۳]

ولادت: ۱۸۲۰ء
وفات: ۱۸۷۵ء

میر نواب مونسؔ کے سلاموں میں وہ تمام خصوصیات اور اوصاف وکمالات موجود ہیں جو ترقی یافتہ دور کے سلاموں کی تعریف کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایک مشہور سلام۔

مجرئی بہتے ہیں آنسو در غلطاں ہو کر　　آبرو بائی ہے کیا چشم نے گریاں ہو کر

کو محمد عباس آصفؔ نے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میر مونس نے آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اخترؔ کے سامنے قیصر باغ کی بارہ دری میں انیسؔ کی پیش خوانی میں اہل مجلس کو سنایا بادشاہ اسے سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ اس کا دوسرا مطلع وہ ہے جس کو لوگ عام طور سے میر انیسؔ کا سمجھتے ہیں حالانکہ وہ میر مونسؔ کا ہے''۔[۱۴]

مجرئی بہتے ہیں آنسوؤ رغلطاں ہوکر — آبروپائی ہے کیا چشم نے گریاں ہوکر
غیر کی مدح کریں شہ کے ثناخواں ہوکر — مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہوکر
شامل آل محمدؐ ہوئے اللہ اللہ — پایا کیا مرتبہ سلماں نے مسلماں ہوکر
شاہ جب کہتے تھے بتلاؤ تو تقصیر مری — سر جھکا لیتے تھے، بیداد پشیماں ہوکر
زلف اکبرؑ کو جو دیکھا سر نیزہ پُرخوں — موئے سر کھول دیئے ماں نے پریشاں ہوکر

مونس کے سلام کی جامعیت قاری کو اس صنف کا گرویدہ بنانے کے لئے کافی ہے۔

لہو روتی ہیں آنکھیں مثل گل اشکوں میں لالی ہے — ہراک شاخ مژہ اے مجرئی پھولوں کی ڈالی ہے
تباہی میں سفینہ آ چکا تھا امت جد کا — یہ کشتی بحر خوں میں ڈوب کر شہ نے نکالی ہے

رئیس

ولادت: ۱۸۲۵ء۔۱۸۲۴ء
وفات: ۱۸۹۱ء

میر عسکری رئیس میر انیس کے منجھلے بیٹے تھے۔ دوسرے مرثیہ گویوں کی طرح رئیس نے بھی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ غزلوں کے مضموں اور انداز دونوں میں تناسب اور توازن ہے غزل کے ایسے اشعار ترقی یافتہ سلاموں میں بہت عمدہ طریقے سے کھپ سکتے ہیں۔ غزل کے دو شعر دیکھیں۔

باعث وحشت ہوئی بے اعتنائی آپ کی — تنکے چنوانے لگی آخر جدائی آپ کی
آپ کی باتوں کا رہتا ہے ہمیں ہر دم خیال — جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

سلام گوئی کا انداز رثا اور بین سے آراستہ ہونے کے ساتھ واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کے طریقہ اظہار کا عمدہ نمونہ ہے۔

سلامی کیوں نہ دل شاہ کو یہ غم توڑے — تڑپ کے ہاتھوں پہ اصغر جو رن میں دم توڑے

ریاض فاطمہ جس طرح دو پہر میں لٹا — اجل نے گل کبھی ایسے نہ دمبدم توڑے

ہمارے قلب نے جیسے اٹھائے ہیں صدمے — کسی کا شیشہ دل یوں نہ سنگ غم توڑے

جو دیکھ لے دل صاف و جہاں نما میرا — سکندر آئینہ اور جام اپنا جم توڑے

اسی کی چشم سے نکلیں گے اشک غم پیہم — یہ ذکر جس کے کلیجے میں خار غم توڑے

شہادت علی اصغرؑ کا کیا لکھوں احوال — جگر کو تیر الم جب دم رقم توڑے

رئیس جیسا کہ صدموں نے ہم کو توڑا ہے

کس کو خلق میں ایسا نہ رنج و غم توڑے

سلیسؔ

ولادت: ۱۸۲۵۔۱۸۲۶ء [۱۵]

وفات: ۱۸۹۰ء

میر انیسؔ کے سب سے چھوٹے بیٹے سلیسؔ کا نام میر محمد تھا۔ سلیسؔ نے فن شاعری اور فن مرثیہ خوانی دونوں انیسؔ سے سیکھی۔ سلیسؔ کے مرثیے اور سلاموں کے سلسلے میں محمد عباس آصفؔ نے لکھا ہے:

''عرصہ ہوا آپ کے مرثیوں کی ایک جلد شایع ہوئی تھی جواب نہیں ملتی۔ سنا ہے کہ کتب خانہ حیدری حیدر آباد دکن نے پھر اسی جلد کو طبع کر کے شائع کیا ہے۔ آپ کے مرثیوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں لیکن جہاں تک ہمارا اندازہ ہے دس بارہ سے کم نہ ہوں گے۔ سلام بھی آپ نے بہت کہے اور سنگلاخ زمینوں میں کہے''۔ [۱۶]

مدحیہ رنگ کے اشعار پر مشتمل ایک سلام، جس کے مقطع سے ان کی دلی کیفیت اور دوستوں اور عزیزوں کی بے مروتی پر شکوے کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سخن ہوں لاکھ مگر دل کا مدعا نہ ملے — وہ ابتدا ہوں کبھی جس کی انتہا نہ ملے

عبث تڑپ کے مجھے ڈھونڈھتا ہے تو اے دوست — وہاں ہوں میں کہ جہاں کا تجھے پتا نہ ملے

جو سونگھ لے وہ کبھی زلف عنبرین حسینؑ — چمن میں پھول سے پھر بھول کر صبا نہ ملے
فقیر دوست علیؑ سا ہوا نہ دنیا میں — غذا نہ کھاتے تھے جب تک کوئی گدا نہ ملے
جو کسب نور رخ شہ کرے نہ وقت سحر — تو آفتاب کے چہرے کو بھی ضیا نہ ملے
یہ آرزوئے دلی ہے کہ قبر بعد فنا — قریب تربت سرور ملے جدا نہ ملے

سلیسؔ خلق سے یوں جاؤں بے نشاں ہو کر
کہ دوست خاک بھی چھانیں تو نقش پا نہ ملے

سلیسؔ نے سلام کے ایک شعر میں تعلّی کو کس خوبی سے برتا ہے ملاحظہ ہو۔

حسینؑ سا کوئی آقا نہ مدح خواں ہم سا
وہ بے عدیل ہیں تو بے نظیر ہم بھی ہیں

اس پورے سلام میں مدحیہ اور رثائی دونوں عناصر کی آمیزش باہم اور متوازی ہے۔ بینیہ اور سوگواری کے جذبات سے لبریز اشعار بھی کئی موقعوں پر مکمل تاثیر کے ساتھ موجود ہیں۔

درِ علیؑ کی بدولت امیر ہم بھی ہیں — اسی جناب کے ادنیٰ فقیر ہم بھی ہیں
نہ بے اصول کوئی منہ سے زمزمہ نکلے — چمن کی سیر میں اے ہم صفیر ہم بھی ہیں
حسینؑ سا کوئی آقا نہ مدح خواں ہم سا — وہ بے عدیل ہیں تو بے نظیر ہم بھی ہیں
بچے گا ہم سے کہاں اڑ کے طائر مضموں — وہ تیز پر ہے تو ہو صید گیر ہم بھی ہیں
اشارے کرتے ہیں اصغر کہ لے چلے کوئی — پدر کی گود میں مشتاق تیر ہم بھی ہیں
پکارے شاہ جو اکبر کا دم نکلنے لگا — تمہیں تمام نہیں کچھ اخیر ہم بھی ہیں
لگا دے ہونٹوں سے جام لبالب اے ساقی — کہ تشنۂ مئے خم غدیر ہم بھی ہیں
برا کہا نہیں دشمن کو بھی کبھی اے دوست — جو معترض ہو تو ہو خورده گیر ہم بھی ہیں
نہ ہاتھ اٹھائیں لٹائے جو گنج کیخسرو — وہ بادشاہ ہے تو ہو، فقیر ہم بھی ہیں

سکینہ قید میں روئی تو کہتے تھے سجاد   قدم ہیں بیڑیوں میں دستگیر ہم بھی ہیں
بھلا حسینؑ کو کس طرح ڈھونڈنے جائیں   جو تم ہو قید تو بی بی اسیر ہم بھی ہیں
بساط کیا ہے کہ جس پر کریں غرور سلیسؔ
بس ایک عبد ذلیل وحقیر ہم بھی ہیں

****

کاملؔ

کاملؔ کا نام سید علی تھا۔ کاملؔ کے حالات زندگی

ولادت: ۱۲۵۱ھ

وفات: ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۵ء

کے بارے میں معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔ ''تذکرہ مرثیہ نگاران اردو'' ۱۷ اور ''قصیدہ نگاران اتر پردیش'' ۱۸ کے مصنفین نے لکھا ہے کہ کامل کو رثائی شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ بچپن سے ہی قصیدے، سلام اور مرثیے کہتے تھے۔ ان کے مراثی کے مجموعے کا نام ''عیار کامل'' ہے جسے مہذب لکھنوی نے شایع کیا تھا۔

کامل کی زبان صاف، سادہ اور پر شکوہ ہے۔ سلام کے لہجہ میں درد کی بے ارادی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ذیل کے سلام سے ان کی قادرالکلامی کا پورا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بہایا خون محبوب خداؐ کے گلعذاروں کا   فلک کیوں ہو گیا دشمن رسول حق کے پیاروں کا
پڑی تھیں میتیں بے گوران کی دشت آفت میں   جبین عرش اعظم پر مکاں تھا جن ستاروں کا
ہزار افسوس وہ سنسان صحرا اور وہ جنگل   تباہی میں کہاں آیا سفینہ تاجداروں کا
پڑا ہے کھیت آل مصطفٰے کا آہ کس بن میں   کہاں لوٹا گیا ہے قافلہ ان بے دیاروں کا
سنانوں پر علم ہوں کٹ کے سر خالق کے سجدے میں   یہ انجام اے فلک اللہ کے طاعت گذاروں کا
بیاباں میں تھیں لاشیں بے کفن آل پیمبر کی   قلق سے چاک سینہ ہو نہ کیوں ان کے پیاروں کا

امیر مینائی

منشی امیر احمد امیرؔ شاہ مینا شاہ (لکھنؤ) سے خاندانی

ولادت: ۱۸۲۹ء
وفات: ۱۹۰۰ء

تعلق ہونے کی وجہ سے مینائی لکھتے تھے۔ غزل کے اچھے شاعر تھے۔ مرثیے اور سلام بھی کہتے تھے۔

سلام گوئی کا طرز اگر چہ رثائی ہے لیکن باطل سے نفرت اور بیزاری کی جھلک ہر شعر میں موجود ہے۔

جو کربلا میں شاہ شہیداں سے پھر گئے ۔۔۔ کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے
نصرانیوں نے حضرت عیسٰی سے کی دغا ۔۔۔ گویا یہودہ موسیٰ عمراں سے پھر گئے
امت کے سرکشوں نے نہ کی نوح سے وفا ۔۔۔ کیا روسیاہ دیو سلیماں سے پھر گئے
کافر ہوئے کہ کعبہ دیں کو کیا خراب ۔۔۔ مرتد ہوئے کہ قبلۂ ایماں سے پھر گئے
دیندار تھے جو لوگ وہ شہ پر فدا ہوئے ۔۔۔ بے دیں تھے جو وہ دین مسلماں سے پھر گئے
ثابت قدم جو تھے وہ رہے کربلا میں ساتھ ۔۔۔ سست اعتقاد سستیٔ ایماں سے پھر گئے
آئے مدد کے واسطے جن و ملک مگر ۔۔۔ انکار بادشاہ غریباں سے پھر گئے

آسودہ دل ہوا نہ زیارت سے اے امیرؔ
سو بار آئے شوق فراواں سے پھر گئے

****

سلطانؔ ۱۹

سلطان العالیہ سلطانؔ بلند پایہ شاعرہ تھیں۔

ولادت ووفات کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی

سلطان اور ان کے شوہر ممتاز الدولہ دونوں مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے۔

سلطانؔ کے سلاموں میں سلام گوئی کے فن کی پوری آب وتاب نظر آتی ہے۔ ان کی شہرت مرثیے اور سلام گوئی دونوں میں تھی لیکن صرف سلام کے نمونے دستیاب ہیں۔ ان کے سلام ''مجرئی کہتے تھے انصار یہ خنداں ہوکر'' کی زمین میں میر مونسؔ نے سلام کہا ہے۔

سلطانؔ کے دو سلام دیکھیں ؎

خمیدہ در شاہ پر سر رہے　　سلامی جو سید ھا مقدر رہے
بتوں کو خدائی نہ کرتے بنی　　ہمیشہ یہ پتھر کے پتھر رہے
ابد تک جیئے بادشاہی کرے　　در شاہ پر جو گدا مر رہے
نہ دی مشک غازی نے مکار کو　　وہی ہاتھ کٹنے پہ تیور رہے
شہیدوں کا ماتم رہا حشر تک　　نہ قاتل رہے اور نہ خنجر رہے
بہت سن میں اکبرؑ سے اصغر تھے کم　　مگر مر کے رن میں برابر رہے

مجرئی کہتے تھے انصار یہ خنداں ہو کر　　عبد قرباں کی کرو شاہ پہ قرباں ہو کر
لب و دنداں پہ سر شاہ کے دیکھی جو چھڑی　　بی بیاں رہ گئیں انگشت بدنداں ہو کر
شمر سے کہتے تھے یہ گبر و نصاریٰ افسوس　　قتل سید کو کیا تو نے مسلماں ہو کر
لائے جبریل جو محضر تو یہ زہرا نے کہا　　قتل شبیر پہ میں مہر کروں ماں ہو کر

ان کے پانچ سلاموں کے مطلع عاشور کاظمی نے قاصد سرسوی کے حوالے سے اپنی کتاب میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''ان کے ایک سلام ''زہے جمال حسین وخوشا لقائے حسین'' کے تین اشعار پر مرزا دبیر کی تضمین سامنے آئی ہے۔شاگرد کے کلام پر استاد (وہ بھی مرزا دبیرؔ) کی تضمین ایک نرالی بات ہے لیکن ایسا ہوا۔''

(اردو مرثیے کا سفر۔عاشور کاظمی:ص۔۱۱۲۶)

حیاتِ حضرت شبیر ہے لقائے حسینؑ
کوئی بزرگ نہ سر پر تھا اب سوائے حسینؑ
حسینؑ روتے تھے خود کہہ کے ہائے ہائے حسینؑ

''فغان و آہ کر، اے مجرئی برائے حسینؑ
نہیں حسینؑ کے ماتم سے کم عزائے حسینؑ''

زمرّدی اثرِ سم سے ہے قبائے حسینؑ
قضا نے قطع کیا ہے کفن برائے حسینؑ
سیاہ کپڑے پہنتے ہیں اقربائے حسینؑ

''سلامی آج مدینے میں ہے قبائے حسینؑ
زمیں سے تابہ فلک غل ہے ہائے ہائے حسینؑ''

دبیرؔ حق ہے تیرے سر پہ اُن کے احساں کا
دعا وہ مانگ کہ شہرہ ہو جس سے ایماں کا
یہ کہہ تُو واسطہ اب دیکے شاہِ مرداں کا

'' صلہ یہی ہے الٰہی سلام سلطاں کا
شتاب روضۂ اقدس مجھے دکھائے حسینؑ''

دیگر سلاموں کے مطلع یہ ہیں:۔

۱۔ مجرا اسے مدام جو راہ رضا میں تھا
۲۔ مضمون عزا دل میں ہے پنہاں بی بی
۳۔ مجرئی مصحف ماتم کی ہیں تصویر حسینؑ
۴۔ زہے جمال حسینؑ و خوشا لقائے حسینؑ

۵۔ اکبرؑ کا رن میں جب نہ سلامی نشاں ملا

****

مانوسؔ

ولادت: ۱۸۴۴ء
وفات: ۱۹۳۱ء

مانوسؔ کے سلاموں میں اس صنف کے جملہ شعری اوصاف پائے جاتے ہیں۔ مانوسؔ کا زمانہ سلام گوئی کے عروج کے بعد کا زمانہ ہے۔ مانوسؔ نے انھیں راستوں پر اپنے قدم بڑھائے جن پر ان سے پہلے کے سلام گو شعرا گذر چکے تھے۔ مونسؔ کے سلاموں میں ان کے پیش رووں کے سلاموں کی خوبیوں کی تکرار نظر آتی ہے۔ پھر بھی لفظوں کی بندش قابل دید ہے۔

فضلِ حق سے مدح کے دریا بہاتے ہی رہے — مبدءِ فیاض سے ہم فیض پاتے ہی رہے
بے کسی پر عابدِ بیمارؑ کی تا شام آہ — آبلے تلووں کے اشکِ غم بہاتے رہے
جب ہوئے بحرِ عمیقِ فکر میں ہم غوطہ زن — گوہرِ مضمون تازہ ہاتھ آتے ہی رہے
مرتے ہی حُر خدمتِ پاکِ پیمبرؐ میں گیا — اپنی جانب غول حوروں کے بلاتے ہی رہے



رکھا جو مجرئی شبیر نے رکاب میں پاؤں — بڑھا فرس کہ رکھوں جادۂ ثواب میں پاؤں
چلے جو لاش پسر پر حسینؑ اشک فشاں — پڑے کہیں سے کہیں رنج و اضطراب میں پاؤں
قدم میں شاہ کے تھا جلوۂ ید بیضا — نہ دیکھے چشم فلک نے بھی ایسے خواب میں پاؤں

ooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooo

سلام کی صنف کے عروج کا زمانہ

(متاخرین کی سلام گوئی)

رسوا

ولادت: ۱۸۵۸ء
وفات: ۱۹۳۱ء

رسوا کا نام مرزا محمد ہادی تھا۔ رسوا کئی علوم میں ماہر تھے ۔ خطابت میں یکتائے روزگار تھے۔ ریاضی، سائنس، علم فلکیات، ڈرامہ، ناول اور موسیقی کے فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ادب وشاعری میں بھی کمال حاصل تھا۔ رسوا کے والد مرزا محمد تقی بھی فارسی، ریاضی اور نجوم کے ماہر تھے۔ رسوا نے یہ علوم اپنے والد سے ہی سیکھے تھے۔ امراؤ جان اور شریف زادہ رسوا کے مشہور ناول ہیں۔

رسوا کے سلام روایتی اور رثائی نوعیت کے ہیں۔ اس کے باوجود جدید طرز شعر گوئی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ رسوا اپنے واردات کو بھی کربلائی رنگ میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنے سلاموں میں مذہبی عقیدتمندی کے علاوہ دیگر مضامین کی شمولیت کی گنجائش نہیں رکھی۔

منزل شوق سے تا سرحد عرفاں جاتے ـــــ کربلا ہوتے ہوئے سوئے خراساں جاتے
لاش اکبر پہ یہ کہتی تھی جوانی روکر ـــــ ایسے دیکھے نہیں دنیا سے پُر ارماں جاتے

****

تجھی کو ہو مبارک ساقیا تیری مئے رنگیں ـــــ لب کوثر پئیں گے ساقی روز جزا والے
سحر کو شمر کے لشکر میں حُر تھا نے رفیق اس کے ـــــ نکل آئے خودی والوں کے مجمع سے خدا والے

****

لخت دل کی ہے بہار آنسوؤں کے تاروں میں ـــــ ٹکڑے یاقوت کے ہیں موتیوں کے ہاروں میں
یاد آتا ہے کسی برہنہ پا کا چلنا ـــــ آج تک ہے غم پنہاں کی خلش خاروں میں
سر اصغر کو جو دیکھا تو یہ بولا انصاف ـــــ کیا یہ بچہ بھی تھا حاکم کے گنہگاروں میں [1]

[1] مکمل سلام بارہ اشعار پر مشتمل ہے۔

جاوؔید

سید محمد کاظم نام تھا لیکن بندہ کاظم کے نام سے مشہور ہوئے۔

ولادت: ۱۸۶۱ء
وفات: ۱۹۲۱ء

جاوؔید کے ہم عصروں میں میر عارفؔ، پیارے صاحب رشیدؔ، دولہا صاحب عروجؔ جیسے باکمال مرثیہ نگار تھے۔ جاوؔید کے والد محمد جعفر امیدؔ بھی مرثیے کہتے تھے۔

جاوؔید کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ لڈن صاحب خورشید کی شاگردی اختیار کی۔ مہذبؔ لکھنوی نے جاوؔید کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یوں تو جملہ اصناف سخن پر قدرت تھی، لیکن مرثیہ گوئی پر طبیعت خاص طور سے مائل رہی اور یہ شغل مرتے مرتے جاری رہا''۔ جاوؔید کا سلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سلام گوئی کے فن میں بھی مہارت رکھتے تھے اور سلاموں کو فن کے جملہ لوازمات سے آراستہ کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ جاوؔید کے وقت میں سلام کا آغاز بغیر کسی تمہید اور علامت کی نشاندہی کے کہے جانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔

سلام کے مطلع میں حضرت حُر اور ان کی فوج کو پانی پلائے جانے کے واقعہ کا بیان کرتے ہوئے جاوؔید نے امام حسینؑ کے دوست اور دشمن دونوں کی نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔

دعائیں شاہ کو اپنے پرائے دیتے ہیں
سپاہ حُر کو جو پانی پلائے دیتے ہیں

جاوؔید کے سلام کے بیشتر اشعار خالص عقیدت مندی سے لبریز ہیں اور ان کا تاثر اور تاثیر بھی روایتی ہے۔ لیکن ردیف و قافیہ کا نیا پن اور رواں بحروں کے انتخاب سے شعر خوانی کے وقت ماتمی احساس کی رَو تیز ہو جاتی ہے اور غم کا تاثر دوبالا ہو جاتا ہے۔

یہ کربلا میں کیا اہل شام نے اندھیر
چراغ خانہ زہرا بجھائے دیتے ہیں

جاویدؔ کو اپنے فن کا رہونے کا احساس ہے اور اس کے اظہار میں وہ کسی تکلف سے کام نہیں لیتے اور انیسؔ کی طرح مضامین نو کے انبار لگانے کے مضمون کو انھوں نے اس انداز سے باندھا ہے۔

خزانہ ہائے مضامیں کبھی کیے تھے جمع
اب آج تو سر منبر لٹائے دیتے ہیں

جاویدؔ نے فن شعر گوئی کی پرکھ رکھنے والوں کو دعوت دیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی سنایا ہے کہ ان کے اشعار کی خوبیوں سے صرف صاحبان نظر اور نکتہ رس لوگ ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

کدھر چھپے ہوئے بیٹھے ہیں جوہری جاویدؔ　　　ہم آج تھوڑے سے موتی لٹائے دیتے ہیں
وہی تو دیکھیں گے جاویدؔ جن کے آنکھیں ہیں　　　ہم آج جوہر ذاتی دکھائے دیتے ہیں

جاویدؔ کے یہاں محاورات کے استعمال کا وہی پرانا نظام ہے جو قدیم زمانے سے چلا آیا ہے۔ لیکن انداز بیان کی طرفگی نے شعر کے حسن اور مضمون کی غم انگیزی کو کس طرح دوبالا کیا ہے اس کا اندازہ اس شعر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

لحد میں لاشہ اصغر کو رکھ کے بولے شہ　　　ہم آج خاک میں ان کو ملائے دیتے ہیں
عدو بھی کہتے تھے سن سن کے زاری زینب　　　یہ کس کے بین کلیجے ہلائے دیتے ہیں

ظلم پر صبر اور مزید ظلم سہنے کا حوصلہ اور ظلم پر ظلم سہنے کے باوجود مزید مقابلے اور برداشت کی قوت کے فروغ کو نئے انداز سے بیان کرتے ہوئے سر جھکانے کی اصطلاح اور محاورہ کو کس خوبی سے صرف کیا ہے کہ خود سر جھکانے والا اپنی ثابت قدمی کی بدولت فاتح نظر آتا ہے۔

پہنانے طوق کو اعدا نہ جانے کب آئیں
امام پہلے سے گردن جھکائے دیتے ہیں

****

اوجؔ

اوجؔ کا نام مرزا محمد جعفر تھا۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ کے

ولادت: ۱۵؍فروری ۱۸۵۳ء
وفات: ۱۸؍اپریل ۱۹۱۷ء

بیٹے تھے۔ اپنے بزرگوں کے عقیدے، طریقے، ماحول اور طرز معاشرت کے زیر اثر اوجؔ نے بھی مرثیہ گوئی کو ہی اپنے فن کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور اسی میں نام بھی پیدا کیا۔ ان کے زمانے تک سلام گوئی کی صنف فن کے تمام لوازم سے آراستہ ہو چکی تھی۔ مسالمے کی مجلسوں کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں بیشتر مسالمے طرحی ہوا کرتے تھے۔ اوجؔ کے انتقال کے تین سال بعد کے ایک مسالمے کا ذکر سکندر آغا نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

اوجؔ کے تقریباً سبھی سلام رثائی اور روایتی ہیں۔ سلاموں کے ہر شعر پر ماتمی فضا چھائی ہوئی ہے۔ واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کی سلاموں میں شمولیت جن کا ذکر امداد امام آثرؔ نے کاشف الحقائق میں کیا ہے، کا شائبہ بھی اوجؔ کے سلاموں میں نہیں پایا جاتا۔ جبکہ ان معاملات کا بیان ان کے دور میں پوری طرح رواج پا چکا تھا۔ لیکن غالباً عروجؔ اپنے والد کے طرز سلام گوئی سے انحراف نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ مرثیہ گوئی میں ان کا مطمح نظر حصول ثواب تھا لہٰذا مرثیت سے علیٰحدہ مضامین حصول ثواب کی راہ میں بہ ظاہر حائل ہوتے نظر آتے تھے۔ شاید اسی لئے عروجؔ نے اپنے سلاموں میں ایسے مضامین کو جگہ نہیں دی۔ اگر کہیں ذاتی واردات بیان بھی کیے ہیں تو اس طرح کہ ؎

یاد آتے ہیں مسافر کربلا کے ہم کو اوجؔ
جن دنوں چلتی ہے لُو مانند صرصر دھوپ میں

ایک سلام کے مقطع میں اپنی شاعری کی زبان اور اس کے طرز پر اشارتاً فخر کیا ہے ؎

اوجؔ کیا خوب کہا پہلے پہل تو نے سلام
کہ ہے تعریف سے بندش کے صفائی باہر

یہ اس سلام کا مقطع ہے جس کے بارے میں سکندر آغا نے لکھا ہے کہ یہ مرزا اوجؔ کا پہلا

سلام ہے۔

شہ کو تقدیر مدینے سے جو لائی باہر	مجرئی قبر سے زہرا نکل آئی باہر
ہو گئے قید حرم بخشش امت کے لئے	حدامکاں سے ہے یہ عقدہ کشائی باہر
کھاکے برچھی جوگرا گھوڑے سے ہم شکل نبیؐ	خیمۂ شاہ سے بانو نکل آئی باہر

مذکورہ سلام میں کُل سولہ (۱۶) شعر ہیں۔

****

عروجؔ

ولادت: ۱۸۶۵ء
وفات: ۱۹۳۰ء

عروجؔ کا نام سید خورشید حسن تھا۔ دولہا صاحب عروجؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔ خورشید علی نفیس کے بیٹے اور میر انیسؔ کے پوتے تھے۔ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں بہت خوش پوش تھے۔ اس لئے پیار سے گھر کی عورتیں ''دولہا دولہا'' کہنے لگیں۔ اور یہی نام مشہور ہوگیا۔ والد کی زندگی میں شعروشاعری سے لگاؤ نہیں تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ایک مرثیہ کہا۔ ۲

انیس کی طرح دولہا صاحب کی شخصیت بھی غیر معمولی اور دل چسپ تھی۔ لیکن علمی خانوادے کی فرد ہونے کے باوجود تعلیم و تربیت سے کسی قدر دور رہے۔ لیکن بعد میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں کمال حاصل کرلیا لیکن اس کا اختتام بھی انھیں کے ساتھ ہوگیا۔ بقول نیر مسعود:۔

''وہ عظیم روایت جو انیسؔ کے عہد میں معراج کمال پر پہنچی تھی دولہا صاحب کے ساتھ ختم ہوگئی''۔ ۳

ایک سلام کی ابتدا معاصرانہ چشمک کے ذکر سے کرتے ہیں۔

تازہ مضموں مدحت شہ میں سناتے ہی رہے	ہم صفیر باغ ہم سے خار کھاتے ہی رہے

عروجؔ کا یہ سلام شاعری کا عمدہ نمونہ ہے جس میں اپنے واردات اور عہد پیری و شباب کے

ذکر کے ساتھ واقعات کربلا اور واقعات راہ کوفہ وشام اور اسیری اہل حرم کی داستان نہایت پر درد شعری پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔

کی نظر اعدا نے حال پائے عابد پر نہ آہ — خار صحرا کے اشاروں سے بتاتے ہی رہے
دیکھ پایا تھا جو راہ شام میں زینب کا حال — آج تک سر پر بگولے خاک اڑاتے ہی رہے
نزع کی زحمت تھی لیکن دیکھ کر روئے علیؑ — تن سے دم نکلا کیا ہم مسکراتے ہی رہے
لائے ششماہے کو خیمے سے امام بحر و بر — سب کو حال زار بچے کا سناتے ہی رہے
مثل قرآں رکھ کے پھر ہاتھوں پہ اور کر کے بلند — چاند سی صورت لعینوں کو دکھاتے ہی رہے
پڑ گیا تیر سہ پہلو چھد گیا سوکھا گلا — خشک ہونٹوں پر زباں اصغر پھراتے ہی رہے
بے محل پیری میں ہے افسانۂ عہد شباب — ولولوں کے ذکر ہی کیا اب کہ جاتے ہی رہے
خال روئے شاہ کی ڈھونڈا کیے جبتک مثال — ہر طرف آنکھوں میں تارے جھلملاتے ہی رہے

باغباں کی طرح ہم بھی طبع موزوں سے عروجؔ
باغ مضموں میں نہال نو بٹھاتے ہی رہے

پورا سلام سولہ اشعار پر مشتمل ہے۔

****

حسرتؔ موہانی

ولادت: ۱۸۷۵ء
وفات: ۱۹۵۱ء

سید فضل الحسن حسرتؔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے مجاہد اور غزل کے کامیاب شاعر تھے۔ قصیدے، مسدس اور سلام بھی کہتے تھے۔ سلام گوئی میں روایت کی پاسداری ملتی ہے۔

امام برحق اہل رضا سلام علیک — شہید معرکہ کربلا سلام علیک
گل مراد ولایت حسینؑ ابن علیؑ — تتمۂ شرف مصطفٰی سلام علیک

ثبوت یہ ہے کہ نور شہادت کبریٰ   تیری جبیں سے نمایاں ہوا سلام علیک

عبث ہے اور کہیں راہ صبر وحق کی تلاش   تری مثال ہے جب رہنما سلام علیک

ترے طفیل میں حسرتؔ بھی ہو شہید وفا

یہی دعا ہے یہی مدعا سلام علیک [۴]

^^

عزیزؔ [۵]

ولادت: ۱۸۸۲ء

وفات: ۱۹۳۵ء

مرزا محمد ہادی عزیزؔ کے بیشتر سلاموں کا تعلق واقعات کربلا سے ہے اور انھیں واقعات کے حوالے سے اخلاقی درس دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اہلبیتؑ کی بارگاہ میں نذرانہ عقیدت کے حوالہ سے دو شعر نقل کیے جاتے ہیں ۔

شہید اعظم و فخر امم سلام علیک   غریب کشتہ تیغ ستم سلام علیک

فروغ دودۂ ختمی مآب نور الہٰ   خجستہ شاہ جمیل الشیم سلام علیک [۶]

****

دردؔ کاکوروی

ولادت: ۱۸۹۱ء

وفات: ۱۹۷۲ء

دردؔ کاکوروی کا اصل نام مکرم احمد تھا۔ لیکن اپنے تاریخی نام میر نذر علی کے نام سے مشہور ہوئے۔ غزل، نعت اور منقبت کے علاوہ مرثیے اور سلام بھی کہتے تھے۔

سلام گوئی کا انداز رثائی اور روایتی ہے۔ عصری لفظیات اور محاورات کا خوبصورت استعمال اس طرح کیا ہے۔

ہے شہیدوں کے لئے آب مصفا کوثر

شمر کم بخت ہے تیرے لئے کالا پانی

شہ یہ فرماتے تھے ہاں اٹھ گیا دانا پانی   اب پلائیں گے ہمیں خلد میں نانا پانی

ساری مخلوق تو پا لے لب دریا پانی — نہ پئے ساقی کوثر کا نواسہ پانی
ہائے پردیس میں کیا شاہ نے بدلا پانی — شمر نے آپ کو خنجر کا پلا یا پانی
ضبط اور صبر کی فرماتے تھے حضرت تلقین — مانگتیں خیمے میں جس وقت سکینہ پانی
حیف ہے ساقی کوثر کے نواسے کے لئے — بند ہو عالم اسلام میں دانا پانی
آ گئی یاد وہیں آل محمدؐ کی پیاس — سامنے جب کسی مظلوم کے آیا پانی
اک اشارہ بھی اگر سبط نبیؐ کا ہوتا — حکم حق سے وہیں مقتل میں برستا پانی
ہے شہیدوں کے لئے آب مصفا کوثر — شمر کم بخت ہے تیرے لئے کالا پانی ۷

تجمؔ آفندی ۸

ولادت: آگرہ، ۱۸۹۳ء
وفات: کراچی ۱۹۷۵ء

مرزا تجمل حسین تجمؔ کا تعلق مرزا جعفر علی فصیحؔ کے خاندان سے ہے۔ تجمؔ اپنے والد بزمؔ آفندی کے شاگرد تھے۔ تجمؔ آفندی نے اپنی خودنوشت سوانح میں لکھا ہے :

''میرے جداعلیٰ مرزا نجف علی بلیغؔ تھے جو مرزا جعفر علی فصیحؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان دونوں سے چھوٹے بھائی ایک اور تھے جن کا نام میرے ذہن میں نہیں رہا۔ غالباً صبیحؔ تخلص تھا۔ یہ مرزا فصیحؔ کے ساتھ مکہ معظمہ چلے گئے تھے''۔ ۹

تجمؔ کی شاعری آفاقی شاعری کی عمدہ مثال ہے۔ ان کا یہ شعر اس دعوے کا ثبوت ہے ۔

جاں نثاروں نے ترے کر دیئے جنگل آباد
خاک اڑتی تھی شہیدان وفا سے پہلے

تجمؔ کی شاعری میں ان کی روح کی آواز سنائی دیتی ہے ۔

سنا کر تجمؔ قصہ کربلا والے شہیدوں کا

مسلمانوں کو سمجھا دو مسلماں ایسے ہوتے ہیں

رثائی شاعری میں ان کا طرز فکر جرأت و ہمت کے ساتھ باغیانہ تیور اور جوش و استقلال کا نیا باب ہے۔ تجم نے اپنے خاندان کی شاعری پر فخر کیا ہے۔

شعور مدح بزرگوں کا فیض ہے اے تجم
زہے نصیب یہ اعزاز خاندانی ہے

تجم کے سلام صرف مذہبی اور عزائی فرائض کی ادائیگی اور امام حسینؑ کی قربانیوں کی قدر دانی کے اظہار تک ہی محدود نہیں ۔ان کے سلاموں میں کربلا والوں کی قربانیوں کے وسیلے سے ایسے پیغامات پوشیدہ ہیں جو انسانیت کو اعلیٰ اقدار کی جانب کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شہید ظلم غریب الدیار کیا کہنا — حسینؑ درد کے پروردگار کیا کہنا
زباں پہ شکر نگاہوں میں درد دل میں تڑپ — نبیؐ کی شان کے آئینہ دار کیا کہنا
یہ ضعف اور یہ لاشہ جوان بیٹے کا — یہ تیرے دوش پہ کوہِ وقار کیا کہنا
شہید ظلم زمانہ شہید ہے تیرا — ہر ایک قوم میں ہیں سوگوار کیا کہنا

کیا یہ ہے زندگی کا نصب العین — یہ ہے تقلید سید کونین
دل دکھاتے رہو غریبوں کا — اور کہتے رہو حسینؑ حسینؑ

****

نظر ڈالے ذرا پستی پہ اپنی — وہ ملت جس کو ناز کربلا ہے

****

کردار پہ اپنے رکھ نگاہ تنقید — خود اپنے لئے شاہد عینی ہو جا
تو مجلس و ماتم میں حسینی ہے ضرور — ہر رنگ میں اے دوست حسینی ہو جا

آل رضا

ولادت: ۱۸۹۵ء
وفات: ۱۹۷۸ء

سید آل رضا اتر پردیش کے ضلع اناؤ کے قصبہ نیوتنی میں پیدا ہوئے۔ رضا نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۹ء میں لکھا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی میں آباد ہو گئے۔ آل رضا جدید فن مرثیہ گوئی کے بانیوں میں ہیں۔ ان کے مرثیے کا انداز جوش سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ ان کا ایک معرکہ آرا سلام یقیناً تمام اردو حلقوں تک پہنچا ہو گا۔

سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا

اپنے ایک سلام بہ عنوان ''تعلیم حسینی'' میں رضا نے کربلا والوں کی تعلیمات کی روشنی میں آج کے پراگندہ ماحول اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی تلقین اس طرح کی ہے۔

کربلا والے نہیں کرب و بلا آج بھی ہے
مرنا آتا ہو تو جینے کا مزہ آج بھی ہے

موت میں زندگی کا مزہ صرف کربلا والوں کی قربانیوں میں ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ سلام خالص رثائی اور روایتی نہج اور انداز سے آگے بڑھ کر اپنے اندر عصری مسائل و معاملات کو سمیٹتا اور ان کے حل کی نشاندہی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

افراتفری کے ماحول اور گوناگوں مسائل میں گھرے معاشرے کے لئے آل رضا کے سلام امید کی کرن اور ثابت قدمی کی تلقین ہیں۔

حق پہ جینے کے لئے صدق پہ مرنے کے لئے
سامنے زندگی آل عبا آج بھی ہے

آل رضا نے پورے سلام کو موجود پس منظر میں تشکیل دیا ہے اور اہلبیتؑ کی تعلیمات سے نبی نوع انسان کی زندگی کی اصلاح اور اس کی بہتری کی راہوں کی نشاندہی کی ہے۔ سلام میں ''آج بھی ہے'' کی ردیف اس بات کی یاد بار بار دلاتی ہے کہ اپنی اصلاح اور بہتری کا وقت

ابھی ہاتھ سے گیا نہیں ہے۔ اگر ہم آج بھی نیکیوں کے حصول کے لئے کمر بستہ ہو جائیں تو اسے تھوڑی سی قربانی اور جدو جہد کے بعد حاصل کر سکتے ہیں۔

آل رضاؔ نے دین اسلام میں تمام مسائل کے حل کا سامان موجود ہونے کی وکالت کرتے ہوئے ہماری بداعمالیوں کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے ۔

مشکلیں ہم نے بڑھالیں کہ مسلماں نہ رہے
ورنہ اسلام بڑا عقدہ کشا آج بھی ہے

رضاؔ پھر بھی پُر امید ہیں کہ انسانیت راہ راست پر آ کر ایک دن ضرور فلاح پائے گی۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ بنی نوع انسان اپنی تمام تر ابتری کے باوجود امام حسینؑ کی قربانی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کا احترام کرتا ہے رضاؔ اپنی امیدوں کو شعر کے سانچے میں اس طرح ڈھالتے ہیں ۔

کچھ تو آثار ہدایت کے نظر آتے ہیں
کم نہیں یہ بھی کہ قدر شہدا آج بھی ہے

ظلم کے خلاف امام حسینؑ کا قدم جتنی مضبوطی اور استواری کے ساتھ اٹھا تھا اس کا نقش انسانیت کے ذہن ودل پر آج بھی ثبت ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی حق وصداقت کا نشان باقی ہے وہ کربلا والوں کی قربانیوں کا ہی ثمرہ ہے ۔

اتنا پُر زور اٹھا شاہ شہید اں کا قدم
رہ گیا بن کے جو نقش کف پا آج بھی ہے

شہادت اور قربانی کی مثالی تصویر اگر کہیں مل سکتی ہے تو وہ بس کربلا ہے جہاں شہادت کا درجہ اپنی معراج کو پہنچا ہوا ہے۔ امام حسینؑ نے شہادت کے درجے کو اس بلندی پر پہنچا دیا جو ساری کائنات کے لئے قربانی کا معیار بن گئی ۔

لے گئے جتنی بلندی پہ شہادت کو حسینؑ
وہی معراج شہادت بہ خدا آج بھی ہے

مقطع میں آل رضا نے ان تاریخی حقیقتوں اور ناانصافیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو آل رسول ﷺ اور ان کے چاہنے والوں سے عبارت ہیں۔ظلم و بربریت کی اس پُر آشوب ذہنیت کی طرف اشارہ دیکھیں۔

کچھ تعلق ہے رضا آل محمدؐ سے ہمیں
لوگ جلتے ہیں تو کیا؟ کل جو ہوا آج بھی ہے

****

جوش ملیح آبادی

ولادت: ۱۸۹۸ء۔۱۸۹۶ء
وفات: ۱۹۸۲ء

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی نے اپنے مرثیوں کو عصری حسیت کا جامہ پہنایا۔نوع بشر کو کربلا کے واقعات کی انقلاب آفریں روح سے فیض حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ظلم و جبر کے خلاف سر پر کفن باندھنے کی ترغیب دی۔

جوش نے اپنی بات کہنے میں صاف گوئی، آزاد خیالی اور بے باکی سے کام لیا اور یہی رویہ اپنانے کی ترغیب دوسروں کو دی ہے۔جوش کے سلام کے اشعار سے بھی ایسے ہی جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

طبع میں کیا تیغ برّاں میں روانی چاہیئے
گل فشانی تا کجا، اب خوں فشانی چاہیئے

بستۂ زنجیر محکومی! خبر بھی ہے تجھے
مہر و مہ پر تجھ کو عزم حکمرانی چاہیئے

مرقد شہزادۂ اکبر سے آتی ہے صدا
حق پہ جومٹ جائے، ایسی نوجوانی چاہیئے

شاہ فرماتے ہیں ''جالے جا خدا کی راہ پر''
موت جب کہتی ہے اکبر کی جوانی چاہیئے

سن کے جن کا نام نبضیں چھوٹ جائیں موت کی
دین کے ساونت کو وہ زندگانی چاہیئے

حوالہ (چوتھا باب)

(الف) متوسطین کی سلام گوئی

۱۔ دلگیر کا نام چھنو لال تھا۔ کایستھ سکسینہ تھے۔ بعض شہادتوں کے مطابق مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئے اور اپنا نام غلام حسین رکھ لیا۔ شاد عظیم آبادی نے فکر بلیغ ص: ۱۲۹ پر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ لکھا ہے کہ ''جوش ولائے اہلبیتؑ میں منشی میوہ رام کی طرح یہ بھی پکے مسلمان اور جوشیلے مومن ہو گئے''۔ جبکہ مسیح الزماں نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ ''یہ نہیں معلوم کہ انھوں نے رسمی طور پر باقاعدہ تبدیل مذہب کیا تھا یا صرف رہن سہن کے انداز اور خیالات کی بنا پر لوگوں نے قیاساً یہ لکھ دیا ہے............دلگیر کے کسی معاصر یا بعد کے تذکرہ نویس نے کہیں ان کے کسی نئے نام کا ذکر نہیں کیا۔ (اردو مرثیے کا ارتقا۔ ص: ۲۴۹)

۲۔ اکبر حیدری نے لکھا ہے:

''دلگیر کی تاریخ پیدائش کسی تذکرے میں ہماری نظر سے نہیں گذری مصحفی نے ریاض الفصحا کی تالیف کے وقت (۱۲۲۱۔۱۲۳۶ھ) ان کی عمر تخمیناً ۲۳ سال لکھی ہے۔ مسیح الزماں نے مصحفی کے بیان کی بیان پر دلگیر کا سن ولادت ۱۱۹۸ھ۔۱۷۸۳ء قرار دیا ہے۔ (اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا۔ ص: ۴۶۸)

۳۔ علی جواد زیدی نے اپنی کتاب ''جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی'' میں پناہ علی بیگ افسردہ اور میر اکبر علی مقبل کے بارے میں لکھا ہے کہ ''غالباً وہ پہلے سلام گو ہیں جنھوں نے سلام کے دو دیوان ''دارالسلام'' اور باب السلام'' کے نام سے مرتب کیے۔ میر اکبر علی مقبل نے سلاموں کا ایک ردیف وار ''دیوان سلام'' مرتب کیا تھا''۔ (ص: ۱۵)

۴ خلیقؔ میر حسنؔ کے بیٹے اور میر انیسؔ کے والد تھے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے لکھا ہے کہ " میر خلیقؔ کے دیوان سلام کا واحد نسخہ راجا صاحب محمود آباد کے بے نظیر کتب خانہ میں آج سے کوئی بیس سال قبل میری نظر سے گذرا تھا۔ اس میں چھیاسی سلام موجود ہیں۔ از مراثی میر خلیقؔ (غیر مطبوعہ) مقدمہ ترتیب وتدوین۔ اکبر حیدری کشمیری

۵ فکر بلیغ۔ ص: ۱۴۳

۶ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ ص: ۱۰۷۔ (لیکن امیر علی جونپوری نے یہ نہیں بتایا کہ اعجازؔ کے بارے میں یہ معلومات انھیں کہاں سے فراہم ہوئیں۔)

۷ مرزا اسلامت علی دبیرؔ حیات اور کارنامے۔ ص: ۱۷۷۔۱۷۶

۸ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات۔ کوکب قدر سجاد علی میرزا۔ ص: ۶۴۹

۹ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات۔ کوکب قدر سجاد علی میرزا۔ ص: ۶۴۹ ۔ ۶۴۸

۱۰ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات۔ کوکب قدر سجاد علی میرزا۔ ص: ۶۴۹

۱۱ ایمان۔ ص: ۱۰۸۔۱۰۲ بہ حوالہ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمت۔ ص: ۶۰۰

۱۲ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات۔ ص: ۶۰۰

۱۳ میر انیسؔ کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔

۱۴ اسلاف واخلاف میر انیسؔ۔ ص: ۲۶۴

۱۵ تذکرہ ماہ وسال۔ مالک رام

۱۶ اسلاف واخلاف میر انیس۔ ص: ۲۴۶

۱۷ امیر علی جونپوری

۱۸ علی جواد زیدی

۱۹ امیر علی جونپوری نے لکھا ہے کہ نواب اودھ شاہ نصیر الدین حیدر ۱۲۴۳ھ۔ ۱۸۲۷ء تا ۱۲۵۳ھ۔ ۱۸۳۷ء کی چہیتی بیگم ملکہ زمانیہ کی بیٹی اور نواب کیواں جاہ کی بہن تھیں۔ (تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ ص: ۲۷۶)

(ب)　متاخرین کی سلام گوئی

۱۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ ص: ۱۳۵

۲۔ میر انیس اور ان کے اخلاف۔ ص: ۳۵۵

۳۔ دولہا صاحب عروج۔ ص: ۱۲

۴۔ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو۔ امیر علی جونپوری۔ ص: ۱۹۲ جلد اول

۵۔ عزیز لکھنوی۔ حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر سید مسعود حسن ردولوی

۶۔ گل تابوت (سلام اور نوحوں کا مجموعہ۔ طبع ہو چکا ہے)

۷۔ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو

۸۔ ''آفندی'' ترکی زبان کا لفظ ہے، صاحب، بزرگ، محترم، مالک۔ عثمانی دور میں ترکی میں چھوٹے افسروں کا لقب۔ بحوالہ فیروز اللغات۔ نجم آفندی نے لکھا ہے مرزا فصیح نے کعبۃ اللہ اور حاجیوں کی اتنی خدمت کی تھی کہ ترکی حکومت نے ان کو آفندی کا خطاب دیا جو نسلاً بعد نسلٍ استعمال ہو سکتا تھا۔ بحوالہ کائنات نجم جلد۔ ص:

۹۔ کائنات نجم جلد اول۔ ص: ۴۳

پانچواں باب

سلام گوئی کی موجودہ صورت حال اور اہم شعرا کا جائزہ

بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس تیس سال تک انیسؔ اور دبیرؔ کے خاندان کے شاگرد مرثیہ نگار لکھنؤ کی ادبی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ میر انیسؔ کے پوتے دولہا صاحب عروجؔ اور مرزا دبیرؔ کے پوتے طاہر صاحب رفیعؔ جیسے اساتذہ کے علاوہ موؤدب لکھنوی، مہذب لکھنوی اور فائقؔ وخبیرؔ جیسے صاحبان علم اور ماہرین فن کے پرچم لہرا رہے تھے۔

یہ شعرا زرخیز ذہن اور عمیق فکر کے مالک تھے۔ انھوں نے رثائی شاعری کے جدید مزاج کی تفہیم وتفہم کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ اس کی وکالت بھی کی، لیکن ساتھ ہی ان شعرا نے مرثیہ کے قدیم ماحول اور اصطلاحات سے بھی اپنے رشتے کو استوار رکھا۔

دکن میں مرثیہ نگاری کا سلسلہ قطب شاہی دور سے بیسویں صدی کے اختتام (بلکہ تادم تحریر) جاری ہے۔ ماضی بعید کے شاعر قلی قطب شاہ سے لے کر ماضی قریب کے سید اصغر حسین ناجیؔ، مسرورؔ، بزمؔ آفندی، نجم آفندی، ناصر زید پوری اور باقر امانت خانی تک یہ فن بزرگوں سے نئی نسلوں تک پہنچا۔ آج کی نسل میں ابراہیم حامیؔ، قائم جعفری، عازم رضوی، صادق نقوی، حسن عابدی وغیرہ مرثیہ کے فن کو نئی زندگی اور نئی فکر سے ہم آہنگ کر رہے ہیں۔[1]

موجودہ دور میں سلام کی صنف مخصوص مذہبی موضوعات کی شمولیت کے ساتھ واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ سے آگے کی منزل میں ہے۔ اب شاعر صرف مذہبی اور عقیدت مندانہ موضوعات اور اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات ومعاملات کے تذکرے تک محدود نہیں، بلکہ اب وہ زیادہ ترقی یافتہ اور جدید نظر آتا ہے۔ اس ترقی اور جدیدیت کی روشنی میں سارے انسانی معاشرے کی اصلاح کا مقصد ان کے پیش نظر ہونے کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کو درپیش دیگر مسائل ومعاملات بھی اس کی گفتگو کا موضوع ہیں۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ملک کی تہذیبی اور ثقافتی مراکز کی تباہی اور اس کے بعد پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں نے جب دنیا کے طرز فکر اور طرز زندگی میں انقلاب برپا کیا تو رثائی ادب پر بھی ان کی بلاخیزیوں کے اثرات صاف طور پر نظر آئے۔

ان تمام مواقع پر کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر وہ موضوعات ومضامین سلاموں میں بھی

در آئے جن سے عالم انسانیت دو چار اور نبرد آزما تھی۔ ان تمام مسائل کی پیش کش کے با وجود سلام گو یوں نے سلام گوئی کے بنیادی مقاصد سے انحراف نہیں کیا اور مجلس عزا کے تقاضوں سے سلاموں کو ہم آہنگ رکھا۔

اسد اریب نے صنف سلام کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کچھ پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''دور جدید میں سلام کی جہت نے نمایاں ترقی کی ہے۔
نئے دور کے تمام تر احساسات اور مجلسی تقاضوں کا تمام تر عکس اس
دور کے ''سلاموں'' میں واضح دکھائی دیتا ہے۔ بعض شاعروں
نے صنف سخن کا ذریعہ اصلاح احوال کے لئے بھی برتا ہے۔''[۲]

ادب کی دوسری اصناف کی طرح رثائی شاعری میں انقلاب اور نئے رجحانات کی راہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہموار ہونی شروع ہوگئی تھی۔ نجم آفندی، آل رضا، جوش ملیح آبادی وغیرہ نے جس انقلابی اور احتجاجی لہجہ کو خصوصیت کے ساتھ ترقی دی۔ اس سلسلہ کی کڑیاں سلام کی صنف سے بھی جڑی ہوئی ہیں۔

موجودہ دور میں سلام گوئی کی نہج کسی قدر روایت سے بغاوت کی جانب گامزن ہے۔ انداز تخاطب غیر روایتی ہونے کے ساتھ طنز کے نشتر سے آراستہ اور کبھی کبھی سرکشی کی حد تک احتجاجی نظر آتا ہے۔

رثائی شاعری میں عصری احساسات کے اظہار کے لئے اس صنف کے لئے مروج عنوانات کے علاوہ دوسرے عنوانات کا استعمال بھی بعض شعرا نے بڑی بے تکلفی اور آزادہ روی کے ساتھ کیا ہے۔ وحید اختر کی نظم ''جشن عزا'' اور جوش ملیح آبادی کی نظم ''ذاکر سے خطاب'' اور ''سوگواران حسینؑ سے خطاب'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ وحید اختر کی نظم ''جشن عزا'' کے ایک شعر سے پوری نظم کے مجموعی تاثر اور ایک مخصوص عقیدے کے لوگوں کے طرز عمل کا بڑی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔

ہمارے عہد میں یوں روز جشن ہوتا ہے
کہ جیسے شمر ہو آ کر شریک بزم عزا

اس طرح کی نظموں کو سلام کے زمرے میں اس وجہ سے شامل کیا جا سکتا ہے کہ صنف سلام کی تعریف کرتے ہوئے امداد امام اثرؔ نے ایک موقع پر لکھا ہے:

''سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ باندھے جاتے ہیں''۔

(کاشف الحقائق۔ جلد دوم۔ ص: ۱۷۷)

اس نقطۂ نظر سے یہ نظمیں واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کے اظہار کا عمدہ اور کارآمد نمونہ قرار پاتی ہیں۔

نجم آفندی نے اپنے ایک سلام میں امام حسینؑ کا غم منانے والوں کی بداعمالیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ اس طرح بنایا ہے۔

دل دُکھاتے رہو غریبوں کا
اور کرتے رہو حسینؑ حسینؑ

سلام کے بدلتے ہوئے موضوعات اور نئے نئے شعری پیکر کے تشکیل پانے کا عمل تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ احساسات کی نوعیت میں تبدیلی، شعر و ادب میں نئے نئے رجحانات کا ظہور اور سائنسی ترقی کے نتیجہ میں سلام کی صنف بتدریج نئے اسلوب اور جدید شعری پیکر سے آراستہ ہو رہی ہے۔

موجودہ دور کے تمام تر مذہبی اور سماجی احساسات اور مجالس عزا کے مقاصد اور تقاضوں سے لوگوں کی روگردانی، عزاداروں کے طرز زندگی کی کج روی اور کج خُلقی پر عمل جراحی جیسی تنقیدی نظر موجودہ دور کے سلاموں میں بہت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

نجم آفندی نے اپنے سلاموں کے ذریعہ اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ

امام حسینؑ کی قربانی صرف چند رسوم کی ادائیگی اور رونے رلانے کے مقصد تک محدود نہیں تھی، بلکہ یہ قربانی بنی نوع انسان کو انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے آراستہ دیکھنا چاہتی ہے۔ تجمؔ نے اپنے سلاموں میں اس بات کی وکالت بہت زور دے کر کی ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دنیا میں جہاں کہیں بھی آزادی سے جینے اور کھلی فضا میں سانس لینے کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ امام حسینؑ کی قربانیوں کا ہی فیض ہے۔

جو حریت کی راہ بتا کر گئے حسینؑ
راہیں نکل رہی ہیں اسی شاہراہ سے

تجمؔ کی شاعری کو ادب برائے ہدف کی شاعری قرار دیتے ہوئے تقی عابدی نے لکھا ہے:

''جہاں تک پیغام حسینی کی تبلیغ و تشہیر کا تعلق ہے، تجمؔ کی شاعری ادب برائے ہدف بن جاتی ہے۔لیکن اس شاعری میں واعظانہ لہجہ نہیں، نصیحت اور پند نہیں، بلکہ جمالیاتی حِس کے ساتھ جذبات اور احساسات کو مہمیز کرنے کی محاکاتی دھیمی روش ہے، جو احساسات کے باریک تار کے ذریعہ قلب میں اتر جاتی ہے اور پھر ذہن روشن ہو جاتا ہے''۔ ۳؎

تجمؔ کے یہاں حسینی پیغام کی تبلیغ کا ایک متوازن مزاج پایا جاتا ہے۔تبلیغ کے مقاصد کی حصولیابی کے لئے انھوں نے کئی موقعوں پر بہت سخت لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔ وہ امام حسینؑ کا غم منانے والوں کے قول وعمل دونوں کو حسینی سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگون کے ایک دوسرے کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے دل برداشتہ ہیں۔اس کی جھلک ان کے بیشتر اشعار میں بہت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

تجمؔ غم حسینؑ منانے والوں میں نمود ونمائش کے بجائے اس قربانی سے سبق لے کر ان کے اپنے اندر بھی ایثار وقربانی کا جذبہ پنپتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں، اور بہت صاف لفظوں میں کہتے ہیں۔

یہ مجلس غم ظلم مٹانے کے لئے ہے　　دنیا کو رہِ راست دکھانے کے لئے ہے
انسان کو انسان بنانے کے لئے ہے　　محدود نہیں سارے زمانے کے لئے ہے

دین کے نام کو دنیاوی فوائد کے حصول کے لئے استعمال کرنے والوں کو نجم نے بہت سادگی کے ساتھ اس طرح خطاب کیا ہے ۔

اقوال حسینی ہیں عمل غیر حسینی
یہ دین کے الفاظ میں دنیا طلبی ہے

جوشؔ کے سلاموں میں بھی انسانی ذہن کو جھنجھوڑنے والا وہی انقلابی آہنگ نظر آتا ہے جو ان کی دیگر اصناف شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔انھوں نے اپنے سلاموں کی ابتدا سلام، سلامی اور مجرا، مجرائی جیسے علامتی الفاظ سے نہیں کی ہے، اور بعض مرثیہ تو سلام کے ابتدائی اشعار سے اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہو پاتا کہ ان اشعار کا تعلق سلام سے بھی ہوسکتا ہے۔ ان اشعار میں نہ واقعات کربلا کا ذکر ہوتا ہے نہ ہادیان دین کی فضیلت اور مصیبت کا بیان ، بلکہ کربلا والوں کی قربانی کے پس منظر میں محض استعارات کے وسیلے سے عوام کے مردہ ضمیر اور خوابیدہ جذبات سے خطاب ہوتا ہے:

طبع میں کیا، تیغ برّاں میں روانی چاہئے　　گل فشانی تا کجا، اب خوں فشانی چاہئے
بستہ زنجیر محکومی ! خبر بھی ہے تجھے　　مہر و مہ پر تجھ کو عزم حکمرانی چاہئے
مرقد شہزادۂ اکبر سے آتی ہے صدا　　حق پہ جومٹ جائے، ایسی نوجوانی چاہئے
شاہ فرماتے ہیں "جالے جاخدا کے نام پر"　　موت جب کہتی ہے اکبر کی جوانی چاہئے

جوشؔ کی سلام گوئی کا طرز متقدمین اور متاخرین دونوں کی سلام گوئی کے طرز واسلوب سے انحراف اور تجدید کا عمدہ نمونہ ہے۔ ابتدا میں سلام مرثیوں ہی کی طرح چند مذہبی اور عقایدی امور کے ذکر اور گریہ وزاری کے مقاصد تک محدود تھے۔ اس کے بعد واردات قلبیہ اور معاملات

ذہنیہ سے تعلق رکھنے والے موضوعات کو جگہ دی جانے لگی۔لیکن جوشؔ نے سلام گوئی کے طرز کو ایک نئی جہت سے متعارف کرایا۔اور سلام گوئی کے مسلمہ موضوعات کی حدود سے اس صنف کو آگے بڑھا کر غیرت وحمیت اور آزادی وحریت کے حصول کا جذبہ اور حوصلہ پیدا کرنے والے موضوعات کی شمولیت کی راہ بھی ہموار کی:

صرف رو لینے سے قوموں کے نہیں پھرتے ہیں دن
خوں فشانی بھی ہے لازم اشک افشانی کے ساتھ
آنکھ میں آنسو ہوں سینے میں شرارِ زندگی
موجۂ آتش بھی ہو، بہتے ہوئے پانی کے ساتھ
جوشؔ ہم ادنیٰ غلامانِ علی مرتضیٰؑ
تمکنت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کے ساتھ

کچھ سنا کیا کہہ رہا ہے جوشؔ! اکبر کا شباب؟ سینہ میں تیروں کے جوانی کو نہانا چاہئے

جوشؔ نے اپنی دو نظموں ''ذاکر سے خطاب'' اور ''سوگواران حسین سے خطاب'' کے ذریعہ امام حسینؑ کی شہادت کے اصل مقصد کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔''ذاکر سے خطاب'' میں انھوں نے واقعہ کربلا کے ذکر کو ذریعہ معاش بنانے والے ذاکروں سے اس طرح خطاب کیا ہے:

تو نہیں روحِ شہیدِ کربلا سے بہرہ مند تیرے شانوں پر تو زلفِ بزدلی کی ہے کمند
سخت استعجاب ہے اے پیشہ ور ماتم پسند پیرِ وضیغم کے سینے میں ہو قلبِ گوسفند
ننگ کا موجب ہے یہ اہلِ وفا کے واسطے
یوں نہ ماتم کر شہیدِ کربلا کے واسطے

مخاطَب یعنی عوام سے گفتگو کے اس انداز نے رثائی شاعری میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کی اس سے پہلے مثال نہیں ملتی۔ امام حسینؑ کے غم میں گریہ وزاری کرنے والوں کو جوشؔ نے ذاکروں کی ریاکاری سے اس طرح آگاہ کیا ہے:

تم سے کچھ کہنا ہے اب اے سوگواران حسینؑ — یاد بھی ہے تم کو تعلیم امام مشرقین ؟
تا کجا بھولے رہو گے غزوۂ بدر وحنین ؟ — کب تک آخر ذاکروں کے تاجرانہ شوروشین؟
ذاکروں نے موت کے سانچے میں دل ڈھالے نہیں
یہ شہید کربلا کے چاہنے والے نہیں

سلام گویوں میں ایک اہم نام آل رضا کا ہے۔ آل رضا زرخیز ذہن اور سنجیدہ غور وفکر کے شاعر ہیں۔ انھوں نے رثائی شاعری کے جدید مزاج کی ضرورتوں کو نہ صرف سمجھا بلکہ ہر موقع پر اسے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے رثائی شاعری کے قدیم مزاج، ماحول اور اصطلاحات سے اپنے رشتے کو وابستہ اور استوار رکھا۔

اب موجودہ دور کے چند اہم سلام گو شعرا کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

****

ناصر لکھنوی

ولادت: ۱۹۳۰ء

تعلیمی اسناد پر ۱۹۳۷ء

سید ناصر حسین ناصؔر نے پندرہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ انھوں نے بے شمار نوحے، سلام اور قصیدے لکھے۔ ناصؔر نے ۱۹۹۹ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اس وقت سے اب تک انھوں نے چار مرثیے کہے ہیں۔ ان کے نوحے اور سلام گھر گھر پڑھے جاتے ہیں۔

****

سلیم رضوی

ولادت: ۱۰رفروری ۱۹۳۴ء

میر تقی حسین سلیم رضوی کا آبائی وطن حیدر آباد دکن ہے۔ سلیم نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ عاشور کاظمی کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے:

''میں نے غزل اور نظم کے علاوہ رباعی، سلام، نوحے اور منقبت وقصائد بھی کہے ہیں''۔ ۴؎

ان کی سلام گوئی کے بارے میں اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔ مرثیہ گوئی میں روایت پسند ہیں اور بین ومصائب کو مرثیہ کی روح سمجھتے ہیں۔

ooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooo

عظیم امروہوی

ولادت: ۲۹راپریل ۱۹۴۵ء

سید عظیم حیدر عظیم امروہوی نے غزل، نظم، نعت، قصیدہ، سلام رباعی، منقبت، نوحے، مرثیے، حتّٰی کہ دوہے، ترائلے اور ہائیکو میں طبع آزمائی کی ہے۔

****

سیادت فہمی

ولادت: ۴رنومبر ۱۹۴۲ء

مولوی سید محمد سیادت فہمیؔ کا پہلا مجموعہ کلام ''بیمار مسیحا'' منقبت اور سلاموں پر مشتمل ہے۔ ان کے سلام بھی بعض وقت مرثیہ کے بند معلوم ہوتے ہیں۔

فہمیؔ کے سلام کا ایک بند دیکھیں جو مصرعوں اور مضامین میں باہمی ربط وتسلسل کے سبب سلام کو مرثیہ کی شکل دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے سلام کے اس نمونے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سلام گوئی کے لئے منفردہ کی ہیئت کے علاوہ دوسرے ہیئتوں کے راستے اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔

غیر خدا کا ہو جو خوف دل سے اسے نکال دو　　نعرۂ حیدری لگاؤ، آئی بلا کو ٹال دو
جاہ و جلال احمدی، حسن و جمال حیدری　　عظمت کردگار ایک، مظہر بے مثال دو
جس کی ہے ذات بے مثال بعد رسولؐ ذوالجلال
اس کی کوئی مثال لاؤ، اس کی کوئی مثال دو

منفردہ سلام کا نمونہ۔

امتحان عشق میں ایسی گھڑی آئی کہ بس　　کربلا میں جب ندائے غیب یہ آئی کہ بس
باپ کی آغوش میں تیر ستم کھانے کے بعد　　اصغر بے شیر کو ایسی ہنسی آئی کہ بس

نظیر باقری

ولادت: ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۸ء

نظیر باقری نے شاعری کا آغاز بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں کیا۔ پہلا کلام ایک نوحہ تھا۔ عام طور پر شعرا غزل سے منقبت، اس کے بعد نوحے سلام اور مرثیے کی طرف آتے ہیں۔ لیکن نظیر باقری نے اپنے شعری سفر کا آغاز کربلا سے کیا۔ اگر چہ انھوں نے غزلیں بھی کہیں۔ لیکن غزلوں کو اولیت نہیں دی۔ ان کے سلاموں کا مجموعہ ''پیاسے دریا'' کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں طبع ہوا ہے۔

تغزل کے عناصر کی فراوانی کے سبب بعض شعرا کے سلام غزلوں کا بدل معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن نظیر باقری کی غزلیں کربلائی استعارات کے نظام میں ڈھلی ہونے کے سبب سلام نظر آتی ہیں۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

صدائے تشنہ لبی جس زمیں سے ابھری تھی　　سدا بہار اسی میں شجر نکل آئے
نظر میں جتنے اجالے ہیں سب یقین کے ہیں　　یہ چاند تارے فلک کے نہیں زمین کے ہیں
وہ زیر تیغ ہوں، تیروں میں ہوں کہ زنداں میں　　جہاں جہاں بھی ہیں سجدے اسی حسینؑ کے ہیں

رضاؔ سرسوی

ولادت: ۱۹۵۰ء تقریباً

رضاؔ سرسوی نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ نثر میں افسانے بھی لکھے۔ لیکن طبیعت کو رثائی شاعری سے زیادہ مناسبت ہے۔ ''ماں'' کے عنوان سے ان کے سلام، منقبت اور نوحوں کا مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شایع ہوا ہے۔ ان کے سلام خالص رثائی سلام کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

تمام عمر یہی سوچ کر میں روتا رہا — کہ ایک اشک تو ہو کم سے کم حسینؑ کے نام
مرا اثاثہ ہی کیا ہے کہ جس کی فکر کروں — بدن زمیں کی امانت ہے دم حسینؑ کے نام
خراج دیتا رہے گا شعور انسانی — سلام لکھتے رہیں گے قلم، حسینؑ کے نام

محسنؔ

ولادت: ۱۹۵۶ء

سید محمد باقر رضوی محسنؔ حیدر آباد دکن کے رہنے والے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے صحافی ہیں۔ محسنؔ کی مرثیہ گوئی قدیم روایات اور جدید رجحانات کا سنگم ہے۔ محسنؔ نے مرثیے کے علاوہ غزل، نظم، سلام اور منقبت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن مرثیے کے علاوہ کسی صنف میں ان کا کلام شایع نہیں ہوا ہے۔

رئیسؔ جارچوی

ولادت: ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۵ء

سید رئیس احمد رئیسؔ کا رجحان شعر گوئی میں بچپن سے تھا۔ ابتدا غزل سے ہوئی۔ اس کے بعد نوحے اور سلام کی جانب توجہ کی سلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا۔

موجودہ دور کے مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ متعدد شعرا ایسے ہیں جو سلام گوئی میں طبع آزمائی کر کے اس کے فن کو جلا بخش رہے ہیں۔ لیکن کسی فن کار کی زندگی میں اس کے فن کی قدر و قیمت کا تعین

آسان نہیں ہے۔ کسی فن کار کے فن کی قدر و قیمت کے تعین کے لئے ماہرین فن کا اپنا مخصوص معیار ہوتا ہے جس پر کھرا اترنے کے لئے فن کار تخلیق کار اور نقاد دونوں کو بڑی صبر آزما منزلوں سے گذرنا ہوتا ہے جس کے لئے انتہائی غیر جانبداری، سخت محنت اور کدو کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔

عموماً شعرا عوامی معیار پر اور کسی حد تک خواص کے نزدیک بھی اپنا اعتبار قائم کر لیتے ہیں۔ لیکن چونکہ فن کی پختگی کی اس منزل میں نہیں ہوتے جو ثقہ حضرات اور نقادان فن کا پیانہ ہوتا ہے۔ مبتدی شعرا اور فن کاروں کے فن کو گفتگو کا موضوع بنانے اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی راہ میں بہت سارے اندیشے اور مصلحتیں حائل ہوئی ہیں۔ جبکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کے فن پر گفتگو کرتے وقت اس کی ذاتی زندگی کے کسی مثبت یا منفی پہلو سے متاثر نہ ہوا جائے، تاکہ تحقیق اور تجزیے کا حق ادا ہو سکے۔ ذہن اور توجہ فن کار کے فن اور فن پارے کے علاوہ کسی غیر ضروری پہلو کی جانب ملتفت ہونے یا بھٹکنے کے بجائے اس کے فن پر مرکوز رہے، تاکہ فن کے مطالبات کا حق ادا ہو سکے۔

موجودہ وقت کے سلام گو شعرا میں صرف چند نام ایسے ہیں جو سلام گوئی کے تسلیم شدہ معیار اور اس کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔ بیشتر شعرا کے فن کی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں ایک مشکل یہ ہے کہ وہ فن کے اس مطلوبہ معیار تک ابھی نہیں پہنچے ہیں جو ماہرین اور نقادان فن مقرر کر چکے ہیں، نہ ان کا کوئی مجموعہ سامنے آیا ہے۔

موجودہ دور میں عبدالواحد خاں مائل ملیح آبادی، سید ظفر الحسن شارب، کالی داس گپتا رضا، عرفان صدیقی، ڈاکٹر پیام اعظمی، مرزا محمد اشفاق شوق لکھنوی، کاظم جرولی اور پروفیسر انیس اشفاق کے نام قابل ذکر ہیں۔

اختتامیہ

اختتامیہ

اِس مقالہ میں سلام کی صنف کے وجود میں آنے سے لے کر ترقی کی منزلیں طے کرنے تک کے ان تمام فنی، ہیئتی اور مقصدی پہلوؤں کو زیر بحث لانے کے ساتھ حتی الامکان ایسے ضروری اشارے اور وضاحتیں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن کا ذکر کرنا تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مقالہ کے ابتدائی ابواب کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ مرثیہ کی یہ ذیلی صنف کن اسباب وعوامل اور اختراعی اذہان کے تحت وجود میں آئی اور پہلا باضابطہ سلام گوشاعر اور سلام کی صنف کا پہلا باضابطہ نقاد کون تھا اور اس فن کو ترقی دینے میں کن لوگوں نے اپنے خون جگر کو صرف کیا۔ سلام گوئی کی صنف کے وجود میں آنے کے تعلق سے محققین کی جو مختلف آرا سامنے آئی ہیں، کسی فن کے متعلق اتنی مختلف اور متضاد آرا بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ محققین کی کچھ آرا منطقی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے حقیقت کے بہت قریب نظر آتی ہیں تو کچھ بہت دور اور کچھ آرا میں توازن پایا جاتا ہے۔ شاعری اور ادب کی اصناف سے واقفیت رکھنے والوں پر یہ ظاہر ہے کہ سلام رثائی ادب کا ایک حصہ ہے۔ اگر چہ یہ اب تک متعین نہیں ہو سکا کہ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا رواج کب ہوا۔ دکنی ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے آخر تک ہر زمانے میں مرثیہ گوئی کا رواج رہا ہے اور ہر شاعر نے کم سے کم ایک یا دو مرثیے ضرور کہے ہیں۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور دکن کے فرمانروا محمدؒ قلی قطب شاہ کے کلیات میں باضابطہ عنوان کے ساتھ مراثی کے نمونے موجود ہیں۔ ابواللیث صدیقی کے مطابق پہلے مرثیہ گو شاعر مُلّا وجہی ہیں۔ چونکہ دونوں معاصر ہیں اور یہ طے کرنے کے لئے کوئی ٹھوس تاریخی اور دستاویزی ثبوت نہیں کہ ان دونوں میں کس کو سبقت حاصل ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے دوسو برس بعد تک شمالی ہندوستان میں مرثیے کہے جانے

کا ثبوت نہیں ملتا۔نصیر حسین خیالؔ نے ''مغل اور اردو'' میں لکھا ہے کہ شمالی ہند میں ہمایوں کی ایران سے واپسی اور شاہ طہماسپ صفوی سے تعلقات قائم ہونے سے پہلے مجالس عزا کا دستور نہیں تھا۔سلام چونکہ مرثیہ اور مجالس عزا سے براہ راست وابستہ صنف ہے اس لئے سلام کے ذکر کے ساتھ مرثیہ اور مجلس کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

رثائی موضوعات سے تعلق رکھنے کے باوجود سلام کئی معنوں میں غزل کے بھی مماثل ہے۔ غزل کی طرح سلام کی پیش کش کا بھی ایک مخصوص ایمائی اور اشاری انداز،اسلوب بیان اور طریقہ کار ہوتا ہے۔اس میں مخصوص استعارے اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔سلام کے اشعار کی شناخت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اصطلاحی نظام کو سمجھ کر اس کی مخصوص لفظیات کو نظر میں رکھا جائے۔ان تمام عوامل کے باوجود سلام نگاری میں مرثیہ کے بنیادی عناصر اور کرداروں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔سلاموں کا ابتدائی دور صرف عقیدت و محبت کے اظہار تک محدود تھا۔زبان و بیان کا کوئی فنکارانہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔سلاموں میں فن کارانہ عناصر کی ماہرانہ شمولیت انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے سے شروع ہوئی۔اس سے پہلے سلام گوئی میں اتنی مہارت پیدا نہ ہونے کا ایک ظاہری سبب یہ بھی تھا کہ شعرا کے سامنے سلام گوئی کا کوئی معیاری نمونہ موجود نہیں تھا،اور نہ خود اردو شاعری ہی ارتقا کی اس منزل کو پہنچی تھی جہاں فن میں معیار کی جستجو کی جاتی ہے۔اس طرح تقریباً دو سو برس تک سلام طرح طرح کے حالات و حوادث سے گذرتا رہا۔اگر چہ میر غلام حسین ضاحکؔ اور میر حسنؔ کے یہاں سلاموں کے اچھے نمونے پائے جاتے ہیں،پھر بھی فن کے نقطۂ نظر سے یہ سلام اس منزل میں نہیں تھے جنھیں محک و میزان کے درجہ میں رکھا جا سکے۔

بعد کے سلام گویوں نے اس بات کی بھر پور کوشش کی ہے کہ سلاموں کو رثائیت اور عقیدت کے عناصر کا پابند تو ضرور رکھا جائے لیکن رثائی حدود کو توڑے بغیر واقعات کربلا اور اس کے مثالی کرداروں کو گوناگوں پہلوؤں کے ساتھ انھیں دل چسپ شعری پیکر اور غزلیہ سانچے میں ڈھال کر پیش کیا جائے جس سے پڑھنے اور سننے والے کو اکتاہٹ محسوس نہ ہو اور شاعر کی صلاحیتیں بھی ایک چھوٹے سے دائرے تک محدود نہ رہ جائیں۔

جس طرح مرثیہ گوئی کے فن میں مخصوص ہیئیہ اور رثائی موضوعات کے علاوہ مضامین کی گنجائش فن کاروں نے اپنی طبیعت کی جودت سے نکال لی تھی، بالکل وہی طرز فکر سلام نگاری کے وقت بھی کارفرما تھی۔

گذشتہ ابواب میں متعدد مقامات پر سلام نگاروں کے اسلوب اور زبان کے استعمال پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ لیکن خاتمہ پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ دکن کے ابتدائی دور کے سلام نگاروں نے اگر چہ اسلوب اور زبان کی تخلیقی صلاحیتوں اور مضمون آفرینی کی جانب زیادہ توجہ نہیں کی، لیکن زبان کے عمومی استعمال اور موضوع کی مناسبت کا پورا خیال رکھا۔ مرزاؔ اور درگاہ قلی خاں جیسے اہم شعرا نے اپنے عہد کے بہترین لسانی عناصر سے کام لیا ہے۔ دلّی کے ابتدائی دور کے سلام نگار یقیناً اپنے عہد کے غزل گویوں کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے زبان اور اسلوب بیان سے زیادہ عقیدت کے اظہار پر توجہ دی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان سلام گویوں کی صلاحیت اس پایہ کی نہ رہی ہو جو سلام گوئی کے فن کو معیار کے اعلیٰ درجہ پر فائز کرنے کے لئے مطلوب تھی۔ لیکن جب میرؔ و سوداؔ نے سلام کی صنف پر توجہ کی تو سلاموں کی صورت حال کچھ اور بہتر ہوئی۔ اگر چہ یہ بلند پایہ شعرا بھی سلاموں کو اس منزل اور مرتبہ تک نہیں پہنچا سکے جو انھوں نے اپنی غزلوں، قصیدوں اور مثنویوں کو عطا کیا تھا۔

لکھنؤی شاعری کے اپنے امتیازات ہیں، ان کے یہاں دوسری اصناف کی بہ نسبت رثائی شاعری کا مزاج بالکل الگ ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لکھنؤ میں شاعری کی روایت دہلی سے آنے والے شعرا نے قائم کی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ میں زبان کے استعمال اور لب ولہجہ کے فرق نے دو ادبی دبستانوں کی بنیاد ڈال دی۔ (اگر چہ بعض محققین اسے ایک مفروضے سے تعبیر کرتے ہیں۔)

مقالہ کے متعلقہ ابواب کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوگا کہ دلگیرؔ، خلیقؔ، انیسؔ، دبیرؔ، غالبؔ، اور مونسؔ نے زبان کے استعمال میں ان معیاروں کو پیش نظر رکھا ہے جن کے نمونے اُس دور کی اعلیٰ پایہ کی غزلوں، قصیدوں اور مثنویوں میں ملتے ہیں۔ ان شعرا نے موضوع کی مناسبت سے

زبان کے ایسے تخلیقی استعمال کی صورتیں نکالیں جن سے عام بول چال کے حسن، لب ولہجہ کی شیرینی اور طرز ادا کے مختلف نشیب وفراز کو خوبی کے ساتھ سلاموں میں اس طرح سمویا جاسکے جس سے واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کے اظہار کے ساتھ سلاموں کا بنیادی مقصد بھی برقرار رہے۔

اس طرح سلام گوشعرا نے سلام کے مضامین میں وسعت پیدا کر کے زندگی کے عمومی مسائل و معاملات کو اس کے مقاصد کے دائرے میں سمیٹ لیا، اور یوں سلام نے رثائی اصناف کی ایک شاخ ہونے کے باوجود غزل گو اور مرثیہ گو دونوں قسم کے شعرا کو اپنی طبیعت کا جوہر دکھانے کا موقع فراہم کیا اس طرح یہ صنف دونوں اصناف کے شعرا کی طبع آزمائی کی جولاں گاہ بن گئی۔

کتابیات

کتابیات

۱۔ انیس کے سلام۔علی جوادزیدی۔ناشر:قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی ۱۹۹۷ء

۲۔ اردومرثیے کاارتقابیجاپوراورگولکنڈہ میں ۱۷۰۰ءتک۔ص:۱۹۸،بحوالہ قدیم اردوادب کی تنقیدی تاریخ۔ازمحمدحسن۔
اترپردیش اردواکادمی ۱۹۸۶ء

۳۔ اردومرثیے کاارتقا۔مسیح الزماں۔پہلی اشاعت ۱۹۶۸ا۔طباعت نظامی پریس لکھنؤ ناشر:کتاب نگر،دین دیال روڈلکھنؤ۔

۴۔ ایمان۔واجدعلی شاہ اختر۔

۵۔ المیزان۔نظیرالحسن فوقؔ۔اشاعت:مطبع فیض عام علی گڑھ،سن ندارد

۶۔ انیس:شخصیت اورفن۔پروفیسرفضل امام۔ناشر:اترپردیش اردواکادمی لکھنؤ سن اشاعت ۲۰۰۱ء

۷۔ اسلاف واخلاف میرانیس۔مولف۔سیدمحمدعباس آصفؔ۔مرتب وناشر۔سیدعلی احمددانشؔ سن اشاعت دسمبر۲۰۰۲ء
انیس ہاوس کوچہ میرانیس لکھنؤ۔طابع ڈائمنڈپریس لکھنؤ

۸۔ اردومرثیہ کی سرگذشت۔اسداریب۔طباعت:جے۔آر۔آفسیٹ پرنٹرزسوئی والان دہلی۲۔ناشر:عاکف بک ڈپو۔
ٹمیا محل دہلی ۶۔سن اشاعت ۱۹۹۲ء

۹۔ اردومیں ترقی پسندادبی تحریک۔خلیل الرحمٰن اعظمی۔ایجوکیشنل بک ہاوس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۔سن اشاعت۔۲۰۰۲ء

۱۰۔ اَسلاف میرانیس۔مسعودحسن رضوی ادیبؔ۔کتاب نگرلکھنؤ۔سن اشاعت:۱۹۷۰ء

۱۱۔ اودھ میں اردومرثیے کاارتقا۔اکبرحیدری کاشمیری۔نظامی پریس لکھنؤ۱۹۸۱ء

۱۲۔ آئینۂ بلاغت‘‘مرزامحمدعسکری۔مطبوعہ۔صدیق بک ڈپو۔سن اشاعت ۱۹۳۷ء

۱۳۔ اصناف سخن اورشعری ہیئتیں۔شمیم احمد۔ناشر:انڈیابک امپوریم،بازارجہاگیرآباد،بھوپال سن اشاعت ۱۹۸۱ء
طباعت:کوالٹی آفسیٹ پرنٹنگ پریس نرینا۔نئی دہلی

۱۴۔ آب حیات۔محمدحسین آزاد۔اترپردیش اردواکادمی۔سن اشاعت:۲۰۰۳ء

۱۵۔ اوراق کربلا۔ مجموعہ مراثی ظہیر دہلوی۔ مرتب: سید اقبال حسین کاظمی۔ طباعت: اوکھائی پریس کراچی۔ ناشر: مرثیہ فاونڈیشن کراچی۔ پاکستان سن اشاعت: دسمبر ۱۹۹۷ء

۱۶۔ اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ)۔ سفارش حسین۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ سن اشاعت جولائی ۱۹۶۵ء

۱۷۔ اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے۔ عنوان چشتی۔ دلی، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۷۵ء

۱۸۔ اردو شاعری کا مزاج۔ وزیر آغا۔ ایجوکیشنل بک ہاوس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۔ طباعت: کوہ نور پریس دہلی۔ سن اشاعت ۱۹۷۴ء

۱۹۔ اردو مرثیے کا سفر۔ (سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک) اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار۔ سید عاشور کاظمی، مطبع: عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی (انڈیا) ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۶

۲۰۔ اردو مرثیے کی روایت۔ مرتب: مسیح الزماں۔ مطبع: دلی پرنٹنگ پریس، شاہ گنج، الہ آباد۔ ۳ ناشر: سید اظہر رضوی، کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ۔ سن اشاعت ۱۹۶۹ء

۲۱۔ اردو شہ پارے۔ محی الدین قادری زورؔ۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد (دکن) سن اشاعت ۱۹۲۹ء

۲۲۔ تنقیدی مطالعے۔ مصنف و ناشر: شارب ردولوی۔ مطبع: نظامی پریس لکھنؤ۔ سن اشاعت: ۱۹۸۴ء

۲۳۔ تاریخ مرثیہ گوئی۔ حامد حسن قادری۔ ہمالیہ بک ہاؤس دہلی، سن اشاعت ۱۹۷۳ء

۲۴۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول)۔ رام بابو سکسینہ۔ ناشر: سید منہال احمد زیدی ارم اپارٹمنٹ۔ بفرزون۔ نارتھ کراچی (پاکستان)۔ بزم خضر راہ، ۸۰۔ انتظار لاج۔ غفار منزل، جامعہ نگر نئی دہلی

۲۵۔ تذکرہ ریختہ گویاں از فتح علی گردیزی۔ مرتب عبدالحق۔ مطبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ سن اشاعت ۱۹۳۳ء

۲۶۔ تذکرہ ماہ و سال۔ مالک رام۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ نئی دہلی۔ مطبع لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ) پٹودی ہاوس دریا گنج نئی دہلی۔ سن اشاعت۔ نومبر ۱۹۹۱ء

۲۷۔ تذکرۂ مرثیہ نگاران اردو۔ موالف و پبلشر مرزا امیر علی جونپوری۔ پرنٹر سرفراز پریس۔ سن اشاعت اگست ۱۹۸۵ء

۲۸۔ تذکرۂ شعرائے اردو۔ بہ تصحیح و تنقید۔ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مطبع: مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ میں طبع ہوا۔ ۱۹۲۲ء

۲۹۔ جواہر سخن۔ ص: ۳۱۳۔ از مولوی محمد مبین چریاکوٹی۔ پہلی جلد: پہلا دور۔ پہلا اور دوسرا حصہ سن اشاعت۔ ۱۹۳۳ء، ہندوستانی اکیڈمی، صوبہ متحدہ، الہ آباد

۳۰۔ جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی۔علی جواد زیدی۔سن اشاعت ۱۹۹۸ء طباعت یونائیٹڈ پریس لکھنؤ

۳۱۔ جواہر سخن۔مرتب مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی۔۱۹۳۳ء۔ہندوستانی اکیڈمی،صوبہ متحدہ،الہ آباد

۳۲۔ خاندان میر انیس کے نامور شعرا۔ضمیر اختر نقوی۔ناشر: مرکز علوم اسلامیہ۔کراچی،سن اشاعت ۱۹۹۴ء

۳۳۔ دکن میں مرثیہ اور عزاداری۔رشید موسوی۔نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔حیدرآباد،سن اشاعت ۱۹۷۰ء

۳۴۔ دکن میں اردو۔نصیرالدین ہاشمی۔ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔نئی دہلی،طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس۔جامع مسجد دہلی۔سن اشاعت: جولائی ۲۰۰۲ء

۳۵۔ دیوان یکرو مرتبہ شمیم احمد۔ادارہ اردو،مظفر پور۔۱۹۷۸ء

۳۶۔ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی۔جعفر رضا۔ناشر: نیشنل کتاب گھر حسن منزل الہ آباد۔مطبع: نیشنل آرٹ پرنٹرز سرائے گڈھا۔الہ آباد سن اشاعت ۱۹۷۳ء

۳۷۔ دیوان حیدری مرتبہ عبادت بریلوی۔طباعت: پنجابی ادبی اکادمی پریس،لاہور۔نشر و اشاعت: اردو دنیا،آرام باغ روڈ کراچی۔ا۔سن ندارد

۳۸۔ روضۃ الشہدا (دہ مجلس): ملا حسین کاشفی۔مرتب خواجہ احمد فاروقی۔شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔سن اشاعت: ۱۹۶۱ء

۳۹۔ روح انیس۔مرتب: سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ناشر: کتاب نگر،دین دیال روڈ،لکھنؤ۔مطبع نظامی پریس وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ۔سن اشاعت ۱۹۸۱ء

۴۰۔ سودا۔شیخ چاند۔ناشر: انجمن ترقی اردو حیدرآباد (دکن) سن اشاعت ۱۹۳۶ء

۴۱۔ سلک سلام دبیر جلد دوم۔تقی عابدی۔ناشر: چغتائی پبلشرز اردو بازار۔لاہور۔مطبع۔کارواں پریس لاہور۔سن اشاعت ۲۰۰۴ء

۴۲۔ عزیز لکھنوی۔حیات اور کارنامے۔مصنف و ناشر: ڈاکٹر سید مسعود حسن ردولوی طبع نظامی پریس وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ۔سن اشاعت ۱۹۸۴ء

۴۳۔ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔پروفیسر محمد حسن،اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء

۴۴۔ کلیات محمد حسین آزاد۔ترتیب و تدوین ڈاکٹر محمد خالد علی صدیقی۔مطبع بھارت آفسیٹ دہلی۔۶ ناشر انجمن ترقی اردو۔احسن منزل عیدگاہ روڈ بلاس پور چھتیس گڑھ۔سن اشاعت ۲۰۰۰ء

۴۵۔ کائنات نجم (جلد اول) تقی عابدی۔ناشر: شاہد پبلیکیشنز،۲۲۵۳ دریا گنج نئی دہلی۔سن اشاعت ۲۰۰۶

۴۶۔ کربل کتھا۔فضل علی فضلی۔ترتیب: مالک رام و مختار الدین احمد۔مطبع۔دیال پرنٹنگ پریس دلی۔ناشر: ادارہ تحقیقات اردو

پٹنہ،اشاعت اول اکتوبر۱۹۶۵ء

۴۷؎ کلیات سودا۔حصہ دوم۔ناشرین: رام نراین لال بنی مادھو، الہ آباد۔مطبع: الہ آباد لیتھوگرافر اینڈ پرنٹرس الہ آباد۔سن اشاعت ۱۹۷۱ء

۴۸؎ کاشف الحقائق۔جلد اول (حصہ دوم) سن اشاعت ۱۹۸۲ء۔ترقی اردو بیورو نئی دہلی

۴۹؎ گل مغفرت۔حیدر بخش حیدری۔ناشر: مجلس ترقی ادب۔نرسنگ داس گارڈین۔کلب روڈ لاہور۔سن اشاعت ۱۹۶۲ء۔ مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی موہر ۷/اگست ۱۹۶۸ء کی لگی ہوئی ہے۔

۵۰؎ گلشن ہند۔میرزا علی متخلص بہ لطف۔عبداللہ خاں نے حیدرآباد دکن سے شایع کیا۔دارالاشاعت پنجاب کے رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور میں چھپا۔سن اشاعت ۱۹۰۶ء

۵۱؎ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ابواللیث صدیقی۔لکھنؤ اردو پبلیشر ۱۹۷۳ء

۵۲؎ میر انیسؔ اور ان کے اخلاف۔مرتب اور ناشر جعفر حسین خاں جونپوری۔مطبع نضامی پریس لکھنؤ۔سن اشاعت ۱۹۸۵ء

۵۳؎ مرزا محمد رفیع سوداؔ۔خلیق انجم۔انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔طباعت: کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلی۔سن اشاعت: جنوری ۱۹۶۶ء

۵۴؎ میرؔ و سوداؔ کا دور۔ثناءالحق (علیگ) ناشر: ادارہ تحقیق و تصنیف وحید آباد کراچی ۱۸۔مطبوعہ: جاوید پریس کراچی۔سن اشاعت ۱۹۶۵ء

۵۵؎ مہذب اللغات۔جلد ششم۔مولف۔پدم شری مہذب لکھنوی۔ناشر: سید احمد میرزا مجرب لکھنوی۔مطبوعہ: نامی پریس خواجہ قطب الدین روڈ لکھنؤ سن اشاعت جولائی ۱۹۸۲ء

۵۶؎ مرزا محمد جعفر اوجؔ۔مصنف و ناشر: سید سکندر آغا۔مطبع نظامی پریس۔سن اشاعت ۱۹۸۵ء

۵۷؎ مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات اور کارنامے۔محمد زماں آزردہؔ۔ناشر: مرزا پبلی کیشن۔حسن آباد رعناواری سری نگر۔مطبع۔ جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز دہلی۔سن اشاعت بار دوم مارچ ۱۹۸۵ء

۵۸؎ موازنہ انیس و دبیر۔علامہ شبلی نعمانی۔مرتب: فضل امام۔ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۔سن اشاعت ۱۹۹۸ء

۵۹؎ مرقع سخن۔ص: ۳۶۔مدیر عمومی۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔مطبوعہ۔اعظم اسٹیم پریس۔چار مینار حیدرآباد دکن۔ ۱۹۳۵ء

۶۰؎ مرثیہ اور مرثیہ نگار۔شارب ردولوی۔ناشر: سمیع پبلی کیشن (پرائیویٹ) لمیٹیڈ ۲۸۷۲۔کوچہ چیلان، دریا گنج نئی دہلی

۱۱۰۰۰۲(انڈیا) سن اشاعت اپریل ۲۰۰۶ء

۶۱۔ مطالعۂ ولی (تنقید وانتخاب) شارب ردولوی سن اشاعت: جنوری ۱۹۷۲ء۔ ناشر: نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ

۶۲۔ مرقع سخن مدیر عمومی سید محی الدین قادری زورؔ۔ اعظم اسٹیم پریس، چار مینار حیدرآباد ۱۹۳۵ء

۶۳۔ مغل اور اردو۔ نصیر حسین خیالؔ۔ پرنٹر اینڈ پبلیشرز شائق احمد عثمانی اینڈ سنس نمبر ۷۵۔ فیرس لین (چونا گلی) کلکتہ۔ سن اشاعت مئی ۱۹۳۳ء

۶۴۔ مراثی میر خلیق (غیر مطبوعہ) مقدمہ ترتیب و تدوین۔ اکبر حیدری کشمیری۔ طباعت: ایجوکیشنل اڈیس۔ ناشر۔ مرثیہ فاؤنڈیشن کامرشیل ایریا ناظم آباد، کراچی سن اشاعت دسمبر ۱۹۹۷ء، مطابق شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ

۶۵۔ نکات الشعرا، میر تقی میرؔ۔ مرتب۔ عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء

۶۶۔ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات۔ کوکب قدر سجاد علی میرزا۔ ناشر: انجمن ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ سن اشاعت ۱۹۹۵ء۔ طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز۔ جامع مسجد دہلی

۶۷۔ وفیات مشاہیر اردو۔ بشارت علی خاں فروغؔ۔ مطبوعہ: کلکتہ آفسیٹ پریس، گنج میر خاں، نئی دہلی۔ ۲ سن اشاعت ۲۰۰۰ء

۶۸۔ وفیات شاہر اردو۔ بشارت علی خاں فروغ۔ سن اشاعت ۲۰۰۰ء مطبوعہ کلکتہ آفسیٹ پریس۔ گنج میر خاں نئی دہلی۔ ۲

۶۹۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ نصیرالدین ہاشمی۔ حیدرآباد، شمس المطابع۔ سن اشاعت ۱۹۳۲ء

رسائل

۱۔ مرثیہ وسلام نمبر (''اسمٰ'' سہ ماہی۔ جون۔ ۱۹۹۳ء)

۲۔ نقد ونظر (تنقیدی ششماہی) ص: ۱۰۱ تجزیہ سلام انیس۔ جلد ۱۱، شمارہ ۱ ۱۹۸۹ء